رجسٹرڈ نمبر اے ۴۱۶۷

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت تین روپیہ
علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن زبان قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکار کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت چار روپیہ
علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جسمیں تاریخ اور انشار لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں، حضرت نیاز کی انشار نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے ..

قیمت دو روپیہ
علاوہ محصول

مختارات نیاز

حضرت نیاز فتحپوری کے افسانوں کا چوتھا مجموعہ، اس میں اکثر و بیشتر وہ افسانے شامل ہیں جو دوسری زبانوں سے لئے گئے ہیں اور اپنی دلچسپی و افادیت کے لحاظ سے خاص درجہ رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ کے مطالعہ سے آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ دوسری زبانوں کے افسانے کیونکر اپنی زبان میں لینا چاہیئے کہ وہ ترجمہ نہ معلوم ہوں، مجلد نہایت عمدہ طباعت و کاغذ اور نفیس گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ

مکتوبات نیاز

دو حصوں میں

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشار میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، اس اڈیشن میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۶ پونڈ کاغذ پر طباعت ہوا ہے۔

قیمت ہر حصہ تین روپیہ
علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔

اڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ
علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات انکی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس کس طرح رائج ہوئی نیز یہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئینگے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مجموعۂ استفسار و جواب حصہ ۲، ۳

اس مجموعہ کی اہمیت کا اظہار بیکار ہے کیونکہ نگار کو جو خصوصیت اس باب میں حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں ان دونوں جلدوں میں سیکڑوں ادبی، تاریخی و تنقیدی مسایل شامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکلوپیڈیا کی ہے۔

قیمت فی جلد تین روپیہ
علاوہ محصول

جھانسی کی رانی

نیاز فتحپوری کے قلم سے

اس ڈرامہ سے نہ صرف ۱۸۵۷ء کے ان واقعات پر روشنی پڑتی ہے جو ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام کا باعث ہوئے بلکہ راجا و رعایا کے ان اندرونی اختلافات کا بھی حال معلوم ہوتا ہے جو ملک کو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں دیدینے کا بڑا سبب تھے اس ڈرامہ کے وہ حصے خصوصیت کے ساتھ بہت دلچسپ ہیں جنمیں رانی کی زندگی کے آخری لمحات کا حال بیان کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ چار آنہ

اصحاب کہف

یہ ڈرامہ ایک مصری انشاء پرداز "توفیق الحکیم" کی کتاب "اہل الکہف" کا ترجمہ ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے نہایت لطیف انداز سے "اصحاب کہف" کی روایت پر عاقلانہ تبصرہ کیا ہے، اس تمثیل کی جان وہ حصہ ہے جہاں موضوع محبت پر گفتگو کی گئی ہے اور اس کی ابدیت کو بالکل اچھوتے انداز سے پیش کیا گیا ہے ترجمہ حضرت نیاز نے کیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ

"نگار" کا جوبلی نمبر

پاکستان نمبر ہوگا

۱۔ لیکن اس میں نہ حصول پاکستان کی تاریخ ہوگی، نہ مسلم لیگ کے جدوجہد کی داستان، کیونکہ اس سے ہر شخص واقف ہے۔ بلکہ پاکستان اور ہندوستان کی تمام مسلم آبادی کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا جائے گا تاکہ مسلمانوں کی یہ جدید آزاد حکومت اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں اور اُن کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی — گویا بہ لحاظ موضوع یہ

تمدن اسلامی نمبر بھی ہوگا

۲۔ اس نمبر کی ضخامت ۲۵۰ صفحات سے زیادہ ہوگی اور اس کی طیاری میں ہم کو تین ہزار روپیہ زاید صرف کرنا پڑیں گے اس لئے خریداران نگار سے امید ہے کہ وہ اس مخصوص نمبر کے لئے جو کتابی صورت میں ۴۰۰ صفحات کو محیط ہوتا۔ سوا روپیہ زیادہ دینا گوارا فرمائیں گے اور یہ سمجھ کر کہ ایسے قیمتی نمبر کو آپ کبھی ہاتھ سے دینا پسند نہ کریں گے۔ ہم ان حضرات کے نام جن کا چندہ دسمبر ۴۷ء یا جنوری ۴۸ء میں ختم ہوتا ہے، جنوری ۴۸ء کا نگار (پاکستان نمبر) ذریعہ وی پی چھ روپیہ آٹھ آنے میں (معہ محصول) روانہ کریں گے اور جن کا چندہ ختم نہیں ہوتا ان کے نام اس کا وی پی ڈیڑھ روپیہ بھیجا جائے گا۔

تمام مقالات اڈیٹر نگار کے قلم کے ہونگے

مختصر فہرست ملاحظہ ہو: — تاریخ سندھ کے اہم واقعات ... قبل مسیح سے ۱۵ اگست ۴۷ء تک — سندھ کی اولین مسلم حکومت۔ سندھ کے مسلم فرمانرواؤں کا حسن انتظام اور ان کی رواداریاں — غزنوی عہد کی برکات — ہندوستان کے مسلم بادشاہوں کی قابل ذکر خصوصیات — علوم اسلامی پر مورخانہ نظر — عجم کے کارنامے اسلام کے عہد زریں میں — حکومت اسلام اور سنسکرت — قدیم تمدن اسلام کی بلندی — اُندلس کے آثار علمیہ — عہد عباسیہ کا دور زریں — فن رقص اور تاریخ اسلام۔ فنون لطیفہ اور اسلام — تاریخ عرب کی ایک روایت جمیل — عہد اسلام میں کنیزوں کا اقتدار — یورپ کی موسیقی پر عربوں کا اثر — موسیقی عہد نبوی و خلفاء راشدین میں — عہد وسطی کے فنون لطیفہ اور اسلام — خواتین عرب کی فیشن طرازیاں وغیرہ۔ وغیرہ — اس نمبر میں حضرت نیاز کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہوگا اور مختصر سوانح حیات بھی، اگر ضخامت بڑھانا ناممکن نہ ہوا۔

جو حضرات سوا روپیہ زاید دینا پسند نہ فرمائیں، وہ ازراہ کرم مطلع فرمادیں تاکہ انکے نام جوبلی نمبر نہ بھیجا جائے۔

غیر خریداران نگار کے لئے اس نمبر کی قیمت معہ محصول سوا تین روپیہ ہوگی۔ — منیجر نگار

تصوف اور اُردو شاعری

از پروفیسر سید صفی حیدر دانش ایم اے

اُردو شاعری فارسی کی گود میں پلی اور گود میں پلی اور گو فارسی کے تمام شاعر صوفی نہ تھے لیکن ان میں آپ کو ایک بھی ایسا نہ ملے گا جس نے اپنی شاعری میں سوز و گداز، رفعتِ تخیل اور پاکیزگی خیالات پیدا کرنے کے لئے تصوف سے مدد نہ لی ہو، اُردو شعراء کو تصوف کی یہ چاٹ ورثہ میں ملی۔ چنانچہ تصوف کے واردات و حقایق اور اس کی اصطلاحات اُردو شاعری میں کچھ اس طرح رچ گئی ہیں کہ جب تک تصوف کا علمی پس منظر اور اس کے باطنی احوال و کوائف کا خاکہ ہمارے سامنے نہ ہو، اُردو شاعری کے فن پاروں سے صحیح معنوں میں محفوظ ہونا قریب قریب ناممکن ہے ـــ اس موضوع پر اُردو میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے۔ مصنف نے شروع میں تصوف کی تاریخ بیان کی ہے۔ اسکے بعد تصوف کے وہ مسایل جن کا اُردو شاعری میں بار بار ذکر آتا ہے، اُن کی وضاحت کی ہے اور ساتھ ساتھ نمونے کے اشعار بھی دئے ہیں اس کتاب میں تصوف کے دقیق حقایق کو مصنف نے ایک حقایق عالم کی طرح سلجھایا ہے اور اُردو شاعری کے محاسن کو ایک صاحب ذوق ادیب کی طرح پیش فرمایا ہے۔ قیمت دو روپے بارہ آنے۔

نئی کتابیں

ضرورۃ القرآن ـــــ قاضی زاہد الحسینی ـــــ للعہ ۸ر

حلیۃ النبی ـــــ آپ کی شمایل کی احادیث کا مجموعہ ـــ عہ ر

کاروانِ خیال ـــ مولانا ابوالکلام کے خطوط کا دوسرا مجموعہ ـــ ہے ۸ر

ردِّ نیچریت ـــــ علامہ جمال الدین افغانی ـــــ عہ ر

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ تاریخ ـــــ عہ ۱۲ر

مشاہدات و معارف (تصوف) ـــــ للعہ ر

تصوف کے آداب و اشغال اور ان کا فلسفہ ـــــ عہ ۱۲ر

مسلمان اور غیر مسلم حکومت ـــ سیاست حاضرہ پر ایک تبصرہ ـ عہ ۸ر

خاتون اسلام کا دستور حیات ـــــ عہ ۱۲ر

صحیفہ سلطان ٹیپو ـــــ محمود مورخ اول ـــ للعہ ر

ارشادات جمال الدین افغانی ـــــ عہ ۸ر

روس انقلاب کے بعد ـــ م م جوہر ـــــ ہے ر

تعلیمی خطبات ـــــ ڈاکٹر ذاکر حسین ـــــ عہ ۸ر

شبلی نامہ ـــ اکرام، مولانا کا ایک شخصی تجزیہ ـــــ ہے ر

خطوط مشاہیر مرتبہ مولانا عبدالماجد دریابادی ـــــ ہے ر

نئے پرانے چراغ ـ (تنقید) آل احمد سرور ـــــ للعہ ۱۲ر

افادی ادب ـــ اختر انصاری ـــــ عہ ۱۲ر

یورپ کے سفر ـــ مولانا محمد علی ـــــ عہ ۸ر

ہندوستانی تعلیم اور اس کے مسایل ـــــ ہے ۱۲ر

رموز اقبال ـــــ ڈاکٹر میر ولی الدین ـــــ عہ ۱۲ر

ننگا پاؤں ـــ افسانے ـ شیر محمد اختر ـــــ عہ ۱۲ر

ہوائی ـــ ناول ـ سلطان حیدر جوش ـــــ عہ ۸ر

امراؤ جان ادا ـــ مرزا رسوا ـــــ ہے ۸ر

لیفٹن سوانح ـــ محمد مسعود جوہر ـــــ عہ ۱۲ر

سندھ ساگر اکاڈیمی - ۵۸ ٹمپل روڈ - لاہور

جو بھی نمبر کا اشتہار صفحہ اپر دیکھ کر جلد سے جلد اطلاع دیجئے کہ آپ اسکو حاصل کرنا چاہتے ہیں یا نہیں

نگار

مدیر خصوصی: نیاز فتحپوری

جلد ۵۲	فہرست مضامین ستمبر ۴۷ء	شمار ۳

ملاحظات ---------- ۳

آزادی اور تقسیم ---------- ۵

انشاء کے اطوار و اخلاق ... رحمت نبی خاں ام۔اے (علیگ) --- ۱۶

ہندسوں کی ایجاد و ترقی پر ایک تحقیقی تبصرہ ---- ح۔ا --- ۲۰

فارسی کے ساقی نامے ---- نذیر احمد ام۔اے۔پی۔ایچ ڈی ۲۸

باب المراسلۃ والمناظرہ ---------- ۳۸

مالہ وما علیہ ---------- ۴۳

مسولینی کے قتل کی داستان ---------- ۴۶

دلچسپ معلومات ---------- ۵۱

گردِ منزل (نظم) --- پروفیسر شور ---------- ۵۶

منظومات ... لطیفی رضوانی سلیمان اریب۔ادیب۔قمر۔حرمت الکرام --- ۵۷

مطبوعات موصولہ ---------- ۵۹

ملاحظات

وقت کا اہم ترین سوال ہندوستان آزاد ہوگیا اور اس میں شک نہیں کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ غاصب حکومت سے جنگ کئے بغیر کسی ملک نے آزادی حاصل کی ہو، لیکن شاید اس کی بھی کوئی دوسری مثال تاریخ میں نہیں ملتی کہ حصول آزادی کے زمانہ میں ایک ہی ملک کی مختلف قوموں نے اس قدر خونریزی کی ہو، جتنی ہندوستان میں ہوئی اور ہو رہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بظاہر دیکھنے میں تو آزادی کا پرچم ہر جگہ لہرا رہا ہے، لیکن لوگوں کے دل غمگین ہیں، روحیں افسردہ ہیں اور بجائے مسرت کے سینہ غموں سے لبریز ہے۔

وہ خاندان یا افراد جو براہ راست اس ہنگامہ سے متاثر نہیں ہیں، وہ ان مصائب کا اندازہ نہیں کر سکتے جن میں اسوقت لاکھوں انسان ملک کے مختلف حصوں میں مبتلا ہیں، اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب تک پانی خود اس کے سر سے نہ گزر جائے، وہ دوسرے ڈوبنے والوں کی پروا کم کرتا ہے، لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اپنے آپ کو ان لوگوں کی جگہ رکھ لیں، جن کی اولادیں ان کے سامنے ذبح کی گئیں۔ جن کی عورتوں کو انکے سامنے بیحرمت کیا گیا اور جن کے گھروں کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا تو تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس ملک کے لاکھوں افراد اس ننگ انسانیت دحشت و درندگی کا شکار ہو رہے ہیں، وہاں شیون و واویلا کا کیا عالم ہوگا اور وہاں کونسا دل ایسا ہو سکتا ہے جو ملک کی اس خونیں آزادی پر

اظہار مسرت کرے گا۔

پھر سوال اس وقت نہ ہندو مسلمان کا ہے، نہ پاکستان و ہندوستان کا اور نہ اس بحث کا کہ ابتدا کس کی طرف سے ہوئی اور کون اس اختلاف و خونریزی کا باعث ہوا، بلکہ صرف اس امر پر غور کرنے کا کہ آیا اس کا سدّ باب ممکن ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کے لئے کیا تدبیر اختیار کرنا چاہئے۔

اس وقت مشرقی اور مغربی پنجاب کے لاکھوں ہندو مسلمان ہجرت کرکے لکھنؤ، دہلی، کراچی اور لاہور پہونچ رہے ہیں اور فضا اس قدر خراب ہوچکی ہے کہ بعض جگہ ریلوں کی آمد و رفت بھی کم ہوگئی ہے، ڈاک کا انتظام بھی درہم برہم ہوگیا ہے، یہاں تک کہ تار و ٹیلی فون کا سلسلہ بھی ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن اس کی اصلاح کے لئے سوا چند مشاورتی کانفرنسوں اور جلسوں کے اس وقت تک کوئی عملی قدم کسی حکومت کی طرف سے نہیں اُٹھایا گیا، کسی علاقہ کو صرف "ہنگامہ زدہ" قرار دیدینا، یا فوج کے ہاتھ میں اس کا انتظام دیدینا، کبھی مفید نہیں ہوسکتا، کیونکہ فوج یا پولیس نہ ہر جگہ پہونچ سکتی ہے اور نہ اس تعصب سے خالی ہوسکتی ہے جو اصل سبب اس نزاع و اختلاف کا ہے۔ بلکہ اس کی صرف وہی ایک تدبیر ہے جو مہاتما گاندھی نے اختیار کی ہے، جس کی تعریف تو سب کرتے ہیں، لیکن اس پر عمل کرنے کی توفیق کسی کو نہیں ہوتی۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت ہندوستان اور پاکستان دونوں کے سامنے بڑے بڑے اہم مسایل ہیں، لیکن امن و سکون کا مسئلہ یقیناً سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ جب تک یہ طے نہ ہو، نہ آیندہ کے لئے کوئی اسلوب کار متعین ہوسکتا ہے اور نہ دفتری انتظام درست ہوسکتا ہے اس کا واحد حل صرف یہ ہے کہ ہندو مسلم جماعتوں کے بڑے بڑے مقتدر لوگ ایک ساتھ ایک تمام علاقہ کا دورہ کریں، ہندو مسلم آبادی کے سر برآوردہ لوگوں کو فراہم کرکے ان کی بے اطمینانی و بے اعتمادی کو دور کرکے ایک دوسرے کے گلے ملوائیں اور اس وقت تک واپس نہ آئیں، جب تک قیام امن و سکون کا پورا اطمینان نہ ہوجائے۔ اس کی ایک روشن مثال ہمارے سامنے موجود ہے اور وہ یہ کہ کلکتہ جہاں مہینوں سے روز کشت و خون کی واردات ہوتی رہتی ہیں، محض مہاتما گاندھی کے خلوص اور عوام کے ساتھ ان کے قیام و اختلاط نے فضا بالکل بدلدی ہے اور امید کی جاتی ہے کہ وہ روز بروز صاف ہوتی جائے گی۔ لیکن اگر قایداعظم یا پنڈت نہرو خود اتنی تکلیف نہیں اُٹھا سکتے (حالانکہ ان کا فرض اولین اس وقت یہی ہے کہ وہ خود جاکر اپنی آنکھوں سے اس کشت و خون کو جاکر دیکھیں) تو پاکستان اور ہندوستان دونوں حکومتوں کو مہاتما گاندھی سے التجا کرنا چاہئے کہ وہ فی الحال نواکھالی کا خیال ترک کردیں اور پنجاب آکر اس آگ اور خون کے کھیل کو ختم کردینے کی کوشش کریں۔

مذاہب کی قدامت پرست دُنیا میں ہلچل ڈال دینے والا
درسِ انسانیت و اخوت عامہ کا پہلا اور آخری صحیفہ

من و یزداں

(اڈیٹر نگار کے قلم سے)

جس میں مذاہب کی تاریخ، خدا کے تصور، رسالت کے مفہوم، کتب آسمانی کی حقیقت اور عقاید دینی کی اصلیت پر نہایت بلند انشا اور خطیبانہ انداز میں علمی، تاریخی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ کاغذ، طباعت و کتابت بہت نفیس، حجم ۲۶۴ صفحات۔ قیمت مجلد سات روپے آٹھ آنے علاوہ محصول ۲۰ ستمبر سے اس کی روانگی شروع ہوجائے گی۔

منیجر نگار - لکھنؤ

آزادی اور تقسیم

یقینی یہ مژدہ ہر ہندوستانی کے لئے مسرت بخش ہے کہ اب وطن عزیز غلامی کے بندھنوں سے آزاد ہو رہا ہے۔ لیکن بڑی حیرت کی بات ہے کہ اس تاریخی موقعہ پر ہم ملک میں خوشی کی وہ لہر نہیں پاتے جو قدرتی طور پر ہونی چاہئے تھی۔ آزادی اور تقسیم کچھ اس طرح ساتھ ساتھ آئی ہے کہ ہماری خوشی آدھی رہ گئی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تقسیم کا رنج آزادی کی مسرتوں پر غالب آگیا ہے اور اس نے ہمیں سوگوار بنا دیا ہے۔

آج ہر محب وطن پر شکست خوردگی کے آثار نمایاں ہیں، کیونکہ ہمیں یہ احساس چین نہیں لینے دیتا کہ ہم نے سیاست کے میدان میں برطانیہ سے شکست کھائی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم برطانی سیاست کا ایک عظیم الشان کارنامہ ہے، جس پر وہ جس قدر فخر کریں کم ہے۔ جس متحدہ ہندوستان کے لئے کانگریس سے اس لئے قربانیاں کرائی گئیں کہ ایک کمزور سے کمزور مرکز بھی قایم رکھا جاسکے۔ اسی مرکز کو برطانی مزدور حکومت نے ایک سال بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور ہمیں بھی اسے مان لینا پڑا، کیونکہ "حالات" سے ہم بھی مجبور تھے لیکن یہ حالات کس کے پیدا کردہ تھے؟ انگریز جب کوئی قدم اٹھانا چاہتا ہے تو اس کے لئے موافق حالات اور سازگار فضا پیدا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ملک کو تقسیم کرنے کے لئے موجودہ فرقہ وار فضا سے بہتر کون سا موقع ہو سکتا تھا۔

کانگریس کی کمزوریاں

لیکن آج ہم جس دلدل میں آکے پھنس گئے ہیں اس کے لئے محض برطانیہ ہی کو موردِ الزام قرار نہیں دیا جاسکتا، بلکہ خود ہماری چند بنیادی غلطیاں بھی ہیں جو یقینی ملک کو اسی سمت لے جانے والی تھیں، جہاں وہ آج ہے۔

مسلمانوں کے معاملہ میں کانگریس نے اپنا یہ اُصول رکھا کہ مسلم عوام الناس کو کانگریس میں لانے کی کوئی کوشش نہ کی جائے، اور ان کا جو شخص بھی لیڈر بن جائے، اُس سے مفاہمت کر کے آزادی کی جد وجہد کو آگے بڑھایا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۲۱ء کے بعد کانگریس نے مسلمانوں کو قطعاً چھوڑ دیا اور اس کا دائرۂ عمل محض ہندوؤں تک محدود رہا جو مسلمان اپنی حبّ وطنی کے سبب کانگریس سے چمٹے رہے، وہ چمٹے رہے، بقیہ کے لئے کانگریس نے کوئی قدم نہ اٹھایا اور دوسری قوموں کو اپنے ساتھ لینے کی کبھی کوئی سنجیدہ جد وجہد نہ کی۔ لہٰذا جب مسلمانوں کو کانگریس نے چھوڑ دیا، تو پھر اس آزاد گھوڑے پر جو بھی سوار بیٹھ گیا، وہ اس کے اشاروں پر چلنے لگا اور جس کسی نے بھی مذہب کا نام لیکر اُسے بُلایا، وہ اسی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ قصور نہ مسٹر جناح کا ہے نہ مسلم لیگ کا۔ اگر مسٹر جناح نہ ہوتے تو کوئی اور مسٹر یا مولانا اُٹھ کھڑے ہوتے اور اگر مسلم لیگ نہ ہوتی تو کوئی اور لیگ یا انجمن بن جاتی۔

غرضیکہ کانگریس نے آج تک مسلم عوام میں کام کرنے کی کبھی کوئی بڑی اور سنجیدہ کوشش نہ کی، اور محض ایک مدِ فضول کی طرح اس کے پروگرام میں "ہندو مسلم" اتحاد شامل رہا اور کانگریس ارگنائزیشن میں کام کرنے کے تجربات کے لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کبھی اس "مدِ فضول" پر کوئی عمل نہ کیا گیا۔ مہاتما گاندھی نے جس قدر زور ہریجن کے مسئلے پر دیا ہے اگر اتحاد کے مسئلہ پر دیتے تو یقینی آج مسلمان کانگریس میں ہوتے۔ اس صورت میں کہ مسلم قوم کا دماغ کانگریس کے ساتھ ہے مسلمانوں کے تمام مفکرین، مدبر، علماء کرام، مقرر، محرر، شعراء اور ادیب کانگریس کے ساتھ ہیں، پھر بھی کانگریس کے اندر خود اس قدر

جھگڑے ہیں کہ اس طرف توجہ کرنے کی نہ کسی کو فرصت رہی اور نہ پروا۔ ۱۹۳۶ء میں جب پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر ہوئے تو انھوں نے نہایت خلوص اور تندہی کے ساتھ مسلم رابطۂ عوام کے کام کو چلانا چاہا، لیکن خود کانگریس والوں نے اس تحریک کو ناکامیاب بنایا، اور یہ تحریک اگر کچھ چلی تو جواہر لال کی وجہ سے صرف صوبہ متحدہ میں چلی، جس کا تھوڑے ہی عرصے میں خاطر خواہ اثر ہوا۔ لیکن مسلم لیگ کی تحریک جوابی کارروائی کے طور پر اور زیادہ زور پکڑ گئی تو اس کنٹیکٹ پروگرام کو بند کر دیا گیا۔ اس تحریک کی ایک بنیادی کمزوری یہ بھی تھی کہ کانگریس نے نہایت غلط طور پر یہ سمجھا کہ کانگریس میں مسلمانوں کو لانے کا کام مسلمان کانگریسیوں اور نیشنلسٹوں ہی کا ہے۔ حالانکہ نیشنلسٹ آرگنائزیشن ہونے کی حیثیت سے یہ کام کانگریس کے ہندوؤں کا بھی تھا۔

مہاتما گاندھی نے مسلمانوں میں کام کرنے کے بدلے جناح کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کو زیادہ مناسب سمجھا، جس کا نتیجہ آج ملک کی تقسیم میں ہمارے سامنے ہے۔ گاندھی جی کی موجودہ مایوسی کا راز یہ ہے کہ انھیں پکی امید تھی کہ جب چاہیں گے جناح کو راضی کر لیں گے۔ کانگریس کے لیڈر اکثر کہا کرتے تھے کہ "بس آج چلے جائیں تو ۲۴ گھنٹوں کے اندر ہندو مسلم سوال حل ہو جائے گا۔ کیونکہ مسلم لیگ اور جناح کی حب الوطنی پر انھیں تکیہ تھا، لیکن ہمارے ان بزرگوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ فرقہ پروری کس حد تک جا سکتی ہے۔ ہمارے لیڈروں نے فرقہ پروری کو مٹانے کی کوشش نہ کی، بلکہ ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے کا شارٹ کٹ (راستہ ڈھونڈھا، یعنی جناح سے مفاہمت۔ لیکن آزادی کا کوئی شارٹ کٹ راستہ نہیں ہے۔ عوام کو ساتھ لینے کے بدلے، لیڈروں کے پیچھے پیچھے بھاگنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔ بنیادی چیز تو یہ تھی کہ ہمیں رجعت پسندی کی کبھی ہمت افزائی نہ کرنی تھی، اور نہ کبھی کسی فرقہ پرور انجمن یا اس کے قائد کی حیثیت کو تسلیم کرنا تھا اور جس طرح کانگریس نے ہندو مہاسبھا کو کبھی منھ نہ لگایا، اور اس کی کوئی پوزیشن نہ بن سکی، اسی طرح مسلم لیگ کو بھی تسلیم نہ کرنا تھا۔ ہمیں رجعت پسندی اور آزادی دشمن طاقتوں سے لڑنا ہے نہ کہ اُسے اور زیادہ طاقتور بنانا۔

لیکن کانگریس کو "مجبوراً" ایسا کرنا پڑا۔ وہ مجبوری کیا تھی؟ وہ کانگریس کی ایک دوسری کمزوری ہے۔ یعنی اس کی بیک وقت انقلابی اور پارلیمنٹری حیثیت۔ کانگریس انقلابی جماعت بھی ہے، اور پارلیمنٹری جماعت بھی۔ کبھی تو وہ انقلابی تحریک اُٹھا کر حکومت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش کرتی ہے، اور کبھی اسی بیرونی حکومت سے تصفیہ کر کے الکشن لڑتی ہے۔ اگر کانگریس محض انقلابی جماعت ہوتی تو اسے کسی سے تصفیہ کی ضرورت نہ تھی، ہم ایک مکمل انقلاب کرتے اور بیرونی طاقت کو منہدم کر کے، فرقہ پروری سے نپٹ لیتے۔ لیکن کانگریس کی یہ بھی پالیسی ہے کہ جو کچھ ملتا جائے لیتے جاؤ اور جس حد تک بھی حکومت کر سکتے ہو کرو۔ مسلم لیگ سے بات چیت کرنے کی ضرورت اسی لئے پیش آئی کہ ہمیں حکومت کرنے کی بھی جلدی ہے، خواہ وہ کیسی ہی ہو، اور چونکہ انگریز کہتا ہے کہ اس کام کے لئے دونوں قوموں میں تصفیہ ہونا ضروری ہے، اس لئے مسلم لیگ سے گفت و شنید کی ضرورت بھی آجاتی ہے۔ کانگریس معقولیت کی بنا پر مسلمانوں کو جو کچھ دے سکتی ہے اس سے زیادہ برطانیہ اُسے دیدیتا ہے اور گفت و شنید بھی بڑھتی جاتی ہے اور مطالبات بھی۔ یہاں تک کہ مساوات (Parity) تک کی نوبت آجاتی ہے۔ لیکن گفت و شنید کی حکمت عملی کا انجام دیکھئے کہ ہم مساوات دیکر بھی مسلم لیگ کو راضی نہ کر سکے۔

مسلم لیگ سے گفت و شنید پر ہم کیوں مجبور ہیں۔ اس کا سبب ایک اور "مجبوری" ہے۔ یعنی جداگانہ انتخاب آج چھوٹے سے بڑے تمام کانگریسی اور غیر کانگریسی لیڈروں کی زبان پر فیشن کے طور پر یہ فقرہ استعمال ہوتا ہے کہ "ہماری ساری پریشانیوں کا سبب جداگانہ انتخاب ہے"۔ لیکن یہی وہ لیڈر ہیں جنھوں نے جداگانہ انتخاب کو ۱۹۱۶ء میں تسلیم کیا تھا۔ اور یہ جانتے ہوئے تسلیم کیا کہ یہ غلط چیز ہے اس کے بعد ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے وقت ایک اور موقع آیا تھا کہ ہم اس زہریلی کو اپنی سیاست سے نکال پھینکتے۔ لیکن اُس وقت پھر کوئی "مجبوری" آگئی کہ ہمیں کمیونل اوارڈ کو تسلیم کرنا پڑا۔

وہ مجبوری کیا تھی - وزارتیں بنانا - اُسی وقت کسی سربرآوردہ لیڈر نے کانگریس میں برسرِ اجلاس کہا تھا "ایسی صورت میں کہ اختیارات مکمل نہیں ملے ہیں، اور انگریز اس ملک کے اندر موجود ہے، ہمیں وزارتیں نہیں بنانی چاہئیں، ورنہ ملک برباد ہو جائے گا" اور وہی ہوا - ہم ۱۹۳۷ء کے الیکشن میں حصہ نہ لیتے، ہماری وزارتیں چولھے بھاڑ میں جاتیں، لیکن ہمیں کبھی اس غلط چیز یعنی جداگانہ انتخاب کو نہ ماننا تھا - ابھی حال میں یو - پی اسمبلی میں گاؤں حکومت بل پیش کرتے ہوئے مسلم لیگ کے جواب میں ڈاکٹر کاتجو نے کیا اچھی بات کہی تھی کہ - "ہم گاؤں میں پنچایتی حکومت کے خیال کو ترک کر دیں گے، گاؤں حکومت بل کو واپس لے لیں گے - لیکن جداگانہ انتخاب کو نہ مانیں گے" غرضیکہ ہم نے جداگانہ انتخاب کو اس لئے مان لیا کہ "مجبور تھے" - کمیونل اوارڈ کو اس لئے مان لیا کہ "مجبور تھے" - مسلم لیگ کو اس لئے مانا کہ مجبور تھے - عارضی حکومت کو اس لئے مانا کہ مجبور تھے - اور بالآخر ہندوستان کی تقسیم کو اس لئے مان لیا کہ "مجبوری تھی" غرضیکہ ہم ایک مجبوری سے دوسری مجبوری میں پھنستے ہی چلے جا رہے ہیں -

آج مجبور کر ہندوستان کی تقسیم مان لی گئی اس لئے کہ ملک میں بدامنی اور خونریزی ہو رہی تھی - لیکن اگر ہمیں دنیا میں ایک آزاد اور بہادر قوم بنکر رہنا ہے تو ہمیں کوئی غلط چیز خونریزی کے ڈر سے نہیں ماننی چاہئے - مارشل پیتان نے پیرس کی خوبصورت عمارتوں اور عورتوں اور بچوں کو بچانے کے لئے فرانس کو ہٹلر کے حوالے کر دیا تھا - چنانچہ فرانس ذلیل و خوار ہوا - اسٹالن نے آدھا روس برباد کر دینا گوارا کیا، لیکن ہٹلر کے غلط مطالبے کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کیا - ہم آزاد ہونے جا رہے ہیں، اگر کوئی بڑی طاقت آج ہم پر حملہ آور ہو اور وہ ہمارے شہروں کو اس طرح تباہ کرنا شروع کر دے، جس طرح اسٹالن گراڈ کو جرمنوں نے برباد کیا تھا تو شاید ہمارے لیڈر اس "مجبوری" میں ملک کو اس کے حوالے کر دیں، اور اس کی غلامی قبول کر لیں کیونکہ مجبوری ہے

فتح کس کی ہے؟

ہم تقسیم ہند کے اس لئے بھی مخالف ہیں کہ اس سے مسلمانوں کو مجموعی طور پر سب سے زیادہ نقصان پہونچا ہے، لیکن مسلمان اپنا نفع نقصان سوچے بغیر زہر ہلاہل کے اس پیالے کو خوشی خوشی نوش جاں کر رہے ہیں -

اصل چیز یہ ہے کہ ہم دنیا کے حالات پر نظر نہیں رکھتے، حالانکہ انگریزوں کی پالیسی کی بدولت دُنیا میں متعدد پاکستان قایم ہو چکے ہیں جس ملک میں بھی انکا منحوس قدم پہونچا ہے، انھوں نے وہاں ایک نہ ایک پاکستان ضرور قایم کیا ہے -

امریکہ میں جب جنگ آزادی چھڑی اور امریکہ نے آزادی کا مطالبہ کیا تو انگریزوں نے امریکہ کے ایک حصے یعنی کناڈا کو اپنی طرف کر لیا اور وہاں بڑے زوروں کی خانہ جنگی کرائی - کناڈا سے علٰحدگی کا مطالبہ کرایا، چنانچہ امریکہ تو آزاد ہو گیا لیکن کناڈا انگریزوں کے پنجے سے نہ نکل سکا، اور وہ آج تک ان کے پنجے میں ہے - برطانی فوج امریکہ سے تو چلی گئی - لیکن کناڈا میں رکھی گئی - یہ پاکستان آج بھی موجود ہے، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ممالک متحدہ امریکہ نے کس قدر ترقی کی اور کناڈا کس طرح اپنی غداریوں اور ناعاقبت اندیشیوں کے سبب پیچھے رہ گیا - اسی صدی کی بات ہے کہ آئرلینڈ نے برطانیہ سے کلّو خلاصی چاہی، آئرلینڈ کی قومی تحریک کو مات دینا بڑا مشکل تھا، لہذا برطانیہ نے وہاں مذہبی سوال پیدا کیا، یعنی کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کا سوال السٹر کے صوبہ کو، جو آئرلینڈ ہی کا ایک جزو تھا، خود ارادیت کے مطالبے کے لئے اُبھارا - چنانچہ السٹر آئرلینڈ سے علٰحدہ کر دیا گیا اور پاکستان بنا دیا گیا - آئرلینڈ آزاد ہے، لیکن السٹر انگریزوں کا غلام ہے - جب آئرلینڈ والوں نے برطانیہ سے فوجیں ہٹانے کا مطالبہ کیا تو وہ ڈبلن سے کوچ کر کے السٹر میں آکر مقیم ہو گئیں یہ ہے برطانوی سیاست کا کمال - آئرلینڈ سے نکل بھی گئے اور آئرلینڈ میں موجود بھی ہیں، بالکل جادوگری ہے، ہند بھی اور

نہیں بھی — حال ہی میں بیچارے مصر نے آزادی کی جد و جہد چھیڑی۔ انگریزوں کو انکا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا، لیکن مصر چھوڑتے ہوئے دل دکھتا تھا، اسلئے انھوں نے سوڈان کو طیار کیا، کہ تم حقِ خود ارادیت کا مطالبہ کرو۔ خود مصری قوم کے ایک حصے نے مصر سے دغا کی، اور مصر کی تقسیم کا مطالبہ کیا، سوڈان مصر سے علٰحدہ کر دیا گیا اور جب مصری نوجوانوں نے کوئٹ (Quit Egypt) کا نعرہ لگایا تو برطانی فوجوں نے اپنا ڈیرہ خیمہ قاہرہ سے اٹھایا اور سوڈان میں لاکر رکھ دیا۔ پاکستان بن گیا۔ اور مصر کے دروازے پر انگریزی افواج کی موجودگی نے مصر کی آزادی کو بالکل بے معنی بنا دیا — چنانچہ اس وقت انگریز مصر میں ہیں بھی اور نہیں بھی۔ یعنی وہ اب سوڈان میں ہیں، لیکن سوڈان میں ان کا وجود اتنا ہی مفید ہے، جتنا کہ وہ مصر میں ہوتے۔ اسی ایشیا میں ابھی ایک اور پاکستان بننے والا ہے۔ یعنی سرزمین فلسطین میں۔

یہی نقشہ ہندوستان میں ہے۔ ہندوستان میں قدم رکھتے ہی انگریزوں نے یہ تلاش شروع کی کہ ہندوستان میں ایسے عناصر موجود ہیں یا نہیں، جنھیں آپس میں لڑایا جا سکے۔ انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ ہندو اور مسلمان شیر و شکر کی طرح ملے ہوئے تھے۔ اتنے ہی ملے جلے تھے کہ انھیں لڑانے میں انگریزوں کو دو سو سال لگ گئے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں سے جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کرایا۔ جداگانہ انتخاب کے بعد جداگانہ ہندوستان کا مطالبہ ہوا۔ اب پاکستان بن جانے کے بعد کوئٹ انڈیا وعدے کے مطابق ہندوستان سے تو انگریزی فوجیں چلی جائیں گی، لیکن وہ دہلی سے بستر اٹھائیں گی اور راولپنڈی میں جا کر رکھ دیں گی، ہندوستان سے نکل بھی گئے اور ہندوستان میں موجود بھی ہیں۔ یہ ہے برطانوی سیاست کی عظیم الشان چالیں، جس کے مسٹر جناح کٹ پتلی بنے ہوئے ہیں،

قیام پاکستان کو مسلم لیگ کی کامیابی سمجھنے والا مسلمان بڑا ہی سادہ لوح اور بھولا بھالا ہے۔ اس بیچارے کو یہ نہیں معلوم کہ آج دنیا میں کس طرح سیاست چل رہی ہے، تمام فیصلے یورپ میں ہوتے ہیں، جن کی ایک لہر ہندوستان میں آجاتی ہے، اور ہمیں ان کے فیصلوں پر صدائے لبیک کہنے کی اس طرح ٹریننگ دیجاتی ہے کہ ہم اسے اپنا ہی فیصلہ اور اپنی ہی جیت کہہ کر پکارتے ہیں۔ آج کانگریس نے جس طرح تقسیم ہند کو مانا ہے، وہ اس کی بیّن دلیل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم پر تمام جماعتیں متفق ہیں، لیکن دراصل یہ فیصلہ برطانی مدبرین کا ہے کہ ہندوستان تقسیم کر دیا جائے اور اب ہمارے اردگرد ایسے حالات پیدا کر دئے گئے کہ ہمارے سامنے تقسیم کو ماننے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں اور ہم اب اس برطانی فیصلے کو خود اپنا فیصلہ سمجھنے لگے ہیں۔

ہندوستان کی تقسیم پر آج امریکہ حیرت انگیز طور پر خاموش ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ امریکہ کی اس وقت دلی خواہش ہے کہ پاکستان بن جائے تاکہ وہ آیندہ جنگ میں روس کے خلاف صوبۂ سرحد کو اپنا زبردست فوجی اڈہ اور مورچہ بنا سکے۔ اسی ہفتے برطانی فوج کے سپہ سالار اعظم فیلڈ مارشل مانٹگومری پاکستان بننے کی خبر سنتے ہی ہندوستان آگئے ہیں، اور مسٹر جناح سے ان کی بات چیت ہو رہی ہے یہ سوچنے کی بات ہے۔

مسلمانوں کو کیا ملا

اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے تو پاکستان کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے طرح طرح کی دلیلیں پیش کی جا رہی ہیں مثلاً — سارے ہندوستان میں ہندوؤں کا غلام بنکر رہنے سے بہتر ہے کہ بعض مقامات پر مسلمانوں کی آزاد حکومت ہو۔ آزادی کی جھونپڑی غلامی کے محل سے بہتر ہے — پاکستان اور ہندوستان دونوں میں اقلیتیں ہوں گی، اور اگر ہندوستان کے مسلمانوں پر مظالم ہوئے تو اس کا بدلہ پاکستان کے ہندوؤں سے لیا جائے گا — پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ بہتر سلوک کیا جائے گا، اس لئے ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے ساتھ اچھا سلوک ہوگا۔ پاکستان بن جانے کے بعد اقلیتوں کی حفاظت زیادہ موثر طور پر ہو سکے گی۔ اگر کلکتہ کا بندرگاہ چھن گیا تو کیا ہوا، ہم چاٹگام کو کلکتہ سے بہتر بندرگاہ بنا لیں گے۔

پاکستان کے پاس چاول، جوٹ، گیہوں اور روئی ہوگی۔ پاکستان خود اپنے کل کارخانے قایم کرے گا، اور ایک صنعتی ملک بن جائے گا۔ پاکستان کی آبادی سات کروڑ کی ہوگی، اور وہ دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہوگا۔ پنجاب کی تقسیم سے سکھوں کے مسئلے سے نجات مل گئی۔ پاکستان میں اسلامی حکومت قایم کی جائے گی اور پھر مسلمان منظم ہوکر سارے ہندوستان کو فتح کریں گے۔ بلوچستان اور مغربی پنجاب میں کوئلہ وغیرہ کا پتہ لگا ہے، اس لئے یہ دقتیں بھی دور ہوجائیں گی۔ پاکستان کے پاس مشرقی اور مغربی ہندوستان میں نکڑ کی جگہیں ہوں گی، جس کے لئے ساری دنیا پاکستان کی خوشامد کرے گی وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال یہ باتیں دل تو بہت خوش کردیتی ہیں، اور بظاہر صحیح بھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن دو منٹ غور کرنے کے بعد انکی حقیقت کھل جاتی ہے۔

یہ کہنا کہ تقسیم نہ ہوتی تو سارے ہندوستان میں مسلمان غلام رہتے۔۔۔ بالکل لغو سی بات ہے۔ وزارتی مشن اسکیم نے مسلمانوں کو بالکل برابر کی پوزیشن دیدی تھی۔ جہاں تک صوبوں کا سوال ہے، چھ صوبے ہندوؤں کو دئے گئے یعنی یو۔پی، بہار، اڑیسہ، سی۔پی، بمبئی اور مدراس اور چھ ہی صوبے مسلمانوں کو دئے گئے تھے، یعنی بنگال، آسام، پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان۔ پھر جہاں تک مرکز کا سوال ہے، اس میں بھی ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوات (Parity) مان لی گئی تھی۔ غرضکہ کیا بلحاظ صوبہ اور کیا بلحاظ مرکز، دونوں حیثیت سے مسلمان برابر کی پوزیشن کے مالک تھے۔ غلامی کا سوال ہی نہیں۔ صوبوں کی مکمل خود مختاری تسلیم کرلی گئی تھی، ان کے گروہ بنادئے گئے تھے، اور مرکز کو صرف تین صیغے (امور خارجہ، دفاع، اور رسل و رسائل) تفویض کئے گئے تھے، ان امور کے علاوہ تمام امور میں صوبے آزاد تھے اور غیر مصرحہ امور بھی صوبوں ہی کے سپرد تھے۔ غرضیکہ اس صورت میں غلامی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اگر غلامی ہی ہے تو کیا نوابزادہ لیاقت علی خاں، مسٹر چندریگر، مسٹر غضنفر علی اور عبدالرب نشتر عارضی حکومت میں ہندوؤں کی غلامی کررہے ہیں، یا مسٹر سہروردی یا غلام حسین ہدایت اللہ، ہندو عارضی حکومت کے غلام ہیں۔ جب موجودہ دستور کے تحت یہ لوگ اسقدر آزاد ہیں، تو وزارتی اسکیم کے تحت کس قدر آزاد ہوتے؟

وزارتی اسکیم اور ۳ر جون کے پلان کا مقابلہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ (۱) وزارتی اسکیم میں مسلمان چھ صوبوں کے مالک ہوتے، اور موجودہ صورت میں صرف تین صوبوں کے مالک ہیں، ایک صوبہ (آسام) قطعاً کھو بیٹھے ہیں، اور دو صوبوں کے صرف نصف نصف حصے ملے ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوؤں کو تین نئے صوبے مل گئے۔ یعنی آسام اور مشرقی پنجاب و مغربی بنگال۔ (۲) وزارتی اسکیم کی رو سے مسلمان چھ ہندو صوبوں میں بھی جملہ قسم کے توازن اور ملازمتوں میں اضافی حقوق کے علی الاتصال حقدار رہتے، اور مرکز میں ۵۰ فیصدی ہونے کے سبب ان کا موثر استحفاظ کرسکتے تھے، لیکن موجودہ صورت میں ساڑھے چار کروڑ مسلم اقلیتوں کو بالکل ہندوؤں کے رحم و کرم پر قطعاً ہندو راج میں چھوڑ دیا گیا ہے (۳) مرکز میں ۵۰ فیصدی ہونے کے سبب مسلمان انڈین یونین کو ہندو بننے سے روک سکتے تھے، اور زبان کلچر وغیرہ کے معاملہ میں ہندوستان بالکل ہندویت کی طرف نہ جاسکتا تھا۔ لیکن اب ہندوستان پر بالکل ہندو کلچر چھا جائے گا اور مسلم تہذیب و تمدن کے تمام آثار مٹ جائیں گے۔۔۔ (۴) وزارتی اسکیم کے مطابق مسلمان سارے پنجاب پر حکومت کرسکتے تھے، جس طرح اب تک کرتے رہے، لیکن اب صرف نصف بنگال اور نصف پنجاب ہی پر کرسکیں گے۔ (۵) وزارتی اسکیم کے تحت کلکتہ کا عظیم الشان شہر اور بندرگاہ، جو خود ایک ملک کے برابر ہے، مسلمانوں کے تحت رہتا، لیکن اب یہ پاکستان سے نکل کر ہندوستان میں چلا گیا۔ (۶) ۳ر جون کے پلان کے مطابق ۶۲ لاکھ مسلمان بنگال سے، ۳۹ لاکھ پنجاب سے، اور ۱۸ لاکھ آسام سے یعنی ایک کروڑ ۱۹ لاکھ مسلمان نکل کر ہندوستان میں چلے گئے، جو

وزارتی اسکیم کے تحت بی، اور سی گروپ میں رہتے۔

غرضکہ مولانا آزاد نے جو فارمولا پیش کیا تھا، اس میں بالکل یہ بیجا فرمایا تھا کہ پاکستان سے مسلمانوں کو جو کچھ فوائد پہونچ سکتے ہیں، وہ سب موجود ہیں۔ لیکن جو نقصانات پہونچ سکتے تھے، وہ تمام چیزیں اس سے نکال دی گئی ہیں چنانچہ اسی فارمولے کے مطابق وزارتی مشن کی اسکیم ترتیب پائی — اس میں مسلمان چھ صوبوں میں اکثریت میں بھی ہوتے ہیں اور مرکز میں بھی پچاس فیصدی کے حقدار ہوتے ہیں یعنی پاکستان تو اپنا تھا ہی، ہندوستان پر بھی ہم چھائے رہتے۔ لیکن اب سارے ہندوستان سے دست بردار ہوکر، ملک کے دو کونوں میں سمٹ گئے ہیں۔ اور اسے اپنی بڑی کامیابی سمجھ رہے ہیں۔

بہرحال پچھلے سمجھوتے (یعنی وزارتی اسکیم) کو غلامی سے تعبیر کرنا محض فریب ہے، اور اگر یہ غلامی ہی تھی تو مسلم لیگ نے ہندوؤں کی اس غلامی کو پہلے کس طرح منظور کر لیا تھا؟

یہ بالکل صحیح ہے کہ غلامی کے محل سے آزادی کی جھونپڑی بہتر ہے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ آزادی واقعی آزادی ہو اور ظاہر ہے کہ آج دنیا میں چھوٹے ملکوں کی آزادی کے کوئی معنی نہیں۔ آج کی دنیا میں آزادی برقرار رکھنے کے لئے جس ساز و سامان کی ضرورت ہوتی ہے، وہ غریب چھوٹے ممالک مہیا نہیں کر سکتے اس وقت برطانیہ، امریکہ اور روس کی طاقت اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ تمام چھوٹی طاقتوں نے ان تین طاقتوں میں سے کسی نہ کسی کا دامن تھام رکھا ہے۔ اقتصادی لحاظ سے بھی یہ طاقتیں بڑی طاقتوں کی محتاج ہیں، اور مشینری اور ہر قسم کے سامان کے لئے بڑے بڑے صنعتی ممالک کے دست نگر ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے ممالک کی اندرونی اصلاح و ترقی کا کام بھی اکثر انھیں بڑے ممالک سے قرض لیکر انجام دیا کرتی ہیں اسلامی ممالک میں ایک ٹرکی ہی تھا جسے مکمل طور پر آزاد کہا جا سکتا تھا، لیکن اس نے بھی روس کے خطرہ سے گھبرا کر امریکہ سے اربوں روپیہ قرض لیکر اس کی اقتصادی غلامی قبول کر لی ہے۔

دفاع کا معاملہ بھی اس قدر پیچیدہ اور قیمتی ہو گیا ہے کہ چھوٹے ممالک اپنی بے بضاعتی کے سبب اس کا معقول انتظام کرنے سے قاصر ہیں۔ گزشتہ جنگ عظیم میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ بڑی طاقتوں کے سامنے کس طرح چھوٹے ممالک ایک ہفتہ بھی نہ ٹھہر سکے، اور فرانس جیسی طاقت نے پندرہ دنوں میں دم توڑ دیا — ہم ہندوستان کی آزادی کا تصور اسی صورت میں کرتے ہیں کہ ہندوستان آزاد ہو کر کوئی چھوٹا ملک نہ ہوگا، بلکہ اپنے قدرتی وسایل کی بدولت بہت جلد وہ امریکہ اور برطانیہ کی ٹکر میں آجائے گا۔ اس وقت غلام ہونے پر بھی ہندوستان، دنیا کے سینکڑوں آزاد ممالک، مثلاً اسپین، ترکی، یونان ایران، افغانستان، عرب، مصر، انڈونیشیا، چین وغیرہ سے زیادہ طاقتور ہے۔

جہاں تک اقلیتوں کی محافظت کے سلسلے میں بدلہ لینے کا سوال ہے، اس کے متعلق صرف یہ عرض ہے کہ بدلہ لینے کی طاقت کس میں ہوگی غریب اور مفلس اور دو حصوں میں بٹے ہوئے پاکستان میں، یا ہندوستان میں؟ پاکستان کی مالی حالت یہ ہے کہ مغربی پاکستان کی مجموعی آمدنی نصف پنجاب نکل جانے کے بعد صرف ۲۵ کروڑ رہ جائے گی جس میں مرکز کی آمدنی بھی شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی قلیل رقم مغربی پنجاب، صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان، یعنی چار صوبوں کے نظم و نسق ہی کے لئے کافی نہیں، اس میں فوج کا خرچ کہاں سے آئے گا۔ جنگ سے قبل صوبۂ سرحد میں حکومت ہند ۶۰ ہزار فوج رکھا کرتی تھی، جس پر ارزانی کے زمانہ میں ۳۵ کروڑ روپے سالانہ صرف ہوا کرتے تھے۔ لہذا اگر پاکستان کے لئے صرف ۶۰ ہزار پیدل سپاہیوں

کی فوج بھی رکھی جائے گی تو ۳۵ کروڑ روپئے صرف اسی ایک مد کے لئے درکار ہوں گے۔ موجودہ آلات و ساز و سامان اس کے علاوہ ہے۔

ہاں اگر بدلے سے ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہندو صوبوں میں مسلمانوں پر ظلم ہوا تو پاکستان میں ہندوؤں سے بدلا لیا جائے گا، یہ چیز نہ صرف غیر مہذب اور غیر اسلامی ہے، بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ ہمارے خیال میں اب مسلمانوں کو کافی سبق مل گیا ہے کہ وہ بدلے کی باتیں کرنی چھوڑ دیں۔ لیکن اگر بدلہ لیا بھی گیا تو مسلم اقلیتوں کو اس سے کیا فایدہ پہونچ سکتا ہے؟ بہار اور گڑھ مکتیسر کے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہونچا؟ پھر ستم ظریفی یہ ہے کہ پاکستان میں صرف دو کروڑ ہندو ہوں گے، لیکن ہندوستان میں ساڑھے چار کروڑ مسلمان ہوں گے۔ لہذا اس بدلے والی پالیسی میں بھی مسلمان ہی سراسر گھاٹے میں رہیں گے۔

مسٹر جناح نے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں کہا ہے کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ روادارانہ اور فیاضانہ سلوک کریں گے۔ لیکن یہ چیز بالکل غلط ہے۔ مسٹر جناح ہندو اور سکھ اقلیتوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہندوؤں کو مسٹر جناح کی فیاضی کی ضرورت بھی نہیں۔ پاکستان کے ہندو محض اتنا ہی چاہتے ہیں کہ ان کی موجودہ پوزیشن برقرار رہے۔ یعنی جس طرح بنگال، پنجاب، سندھ اور صوبۂ سرحد کے بنکوں، انشورنس کمپنیوں، کارخانوں اور تجارتی منڈیوں پر اس وقت ان کا قبضہ ہے وہ علیٰ حالہٖ قایم رہے۔ کیا مسٹر جناح ہندو بنکوں، انشورنس کمپنیوں، ملوں اور بزنس کی حفاظت کریں گے؟ اور اگر وہ ایسا کریں گے تو پھر انھیں پاکستان بنانے سے کیا فایدہ ہوگا؟ مسلمان تو ویسے ہی قلاش کے قلاش رہ جائینگے لہذا لامحالہ پاکستان میں قانون کے ذریعہ ہندو بزنس کو روکنے اور چھیننے کی کوشش کی جائے گی، اور گرچہ یہ حرکت مہذب دنیا کو ناگوار گزرے گی لیکن پاکستان کو اپنی بقا کے لئے یہ کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ اگر پاکستان کے اندر صنعت و تجارت کا دروازہ ہر قوم کے لئے برابر کھولا دیا گیا، تو مسلمان کبھی، اس معاملہ میں ہندو سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہندو کوئی مراعات نہیں چاہتا، وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ حکومت اس پر کوئی پابندی نہ لگائے اور جہاں تک ملازمتوں کا سوال ہے، ہندو یہ کہتا ہے کہ یہ نعمت مسلمانوں ہی کو مبارک ہو، پاکستان میں ملازمت کے لئے ہندو پریشان نہیں۔

غرضیکہ پاکستان کے اندر ہندوؤں کے ساتھ لامحالہ اس قسم کی حرکتیں کی جائیں گی، جس کا لازمی طور پر ہندوستان پر اثر پڑے گا۔ یہ چیز تو ابھی سے شروع ہو گئی جبکہ پاکستان بنا بھی نہیں ہے۔ کراچی کی تمام بڑی بڑی عمارتوں پر حکومت نے قبضہ کر لیا ہے، تاکہ دارالسلطنت پاکستان کا عملہ اور دستور ساز اسمبلی کے اراکین کو ان میں ٹھہرایا جا سکے۔ یہ تمام عمارتیں ہندوؤں کی ہیں۔ جب ہندوؤں نے یہ کہا کہ ہم یہ تمام عمارتیں ہندوؤں کی ہیں ——— اور ہم یہ تمام عمارتیں بیچنے کو طیار ہیں، حکومت خرید لے، تو حکومت نے جواب دیا کہ حکومت کے پاس پیسے نہیں۔

اخبار "ڈان" بار بار یہ لکھ رہا ہے کہ چاٹگام، کلکتہ سے اچھی بندرگاہ بن سکتا ہے اور چاٹگام کے پورٹ بن جانے کے بعد کلکتہ کی اہمیت جاتی رہے گی انگلستان سے چند ماہرین آئے تھے، جنھوں نے اپنی رپورٹ میں یہ لکھا تھا کہ اگر ۳۵ لاکھ روپئے صرف کئے جائیں تو چاٹگام بھی اچھا پورٹ بن سکتا ہے اور یہ کلکتہ سے بہتر بندرگاہ ہو جائے۔ چنانچہ ڈان اکثر ان ماہرین کا حوالہ دیتا رہتا ہے لیکن ان ماہرین نے جن بنیادوں پر یہ رائے دی تھی، اسے ڈان نظر انداز کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اچھی یا بری بندرگاہ خود کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز یہ ہے کہ اس بندرگاہ کے پیچھے کتنے صوبے ہیں، اور یہ ملک کے کتنے حصے کی ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ کلکتہ کی اہمیت محض اسی سبب ہے کہ آسام، بنگال، اڑیسہ، بہار اور یوپی کے صوبے اور ریاستیں غرضکہ آدھا ہندوستان اپنا مال کلکتہ ہی سے منگواتا ہے۔ یعنی امبھالہ سے کانپور اور غازی آباد تک کلکتہ ہی سے مال منگایا جاتا ہے۔ پاکستان بن جانے کے سبب کلکتہ کی

اہمیت میں صرف مشرقی بنگال کی کمی ہو جائے گی۔ جس سے کوئی خاص اثر نہ پڑے گا۔ بقیہ علاقے اسی طرح کلکتہ سے اپنا مال منگاتے رہیں گے لیکن چاٹگام پر ۳۵ لاکھ کیا ۳۵ کروڑ روپئے بھی صرف کر دئے جائیں تو وہ کلکتہ جیسی اہمیت حاصل نہیں کر سکتا، کیونکہ وہ محض ایک صوبہ یعنی مشرقی بنگال کا پورٹ اور تجارتی مرکز بن سکتا ہے۔

پاکستان کے اندر چند زرعی پیداوار کو نہایت اہمیت دی جا رہی ہے، جیسے چاول، گیہوں، روئی، جوٹ وغیرہ۔ لیکن آج کی دنیا میں زراعتی ملکوں کی کوئی پوزیشن نہیں ہے۔ دنیا میں جتنی بڑی طاقتیں ہیں یا ترقی یافتہ ممالک ہیں، وہ اپنی زراعت یا زراعتی پیداوار کے سبب طاقتور نہیں بلکہ اپنی صنعتوں کے سبب طاقتور ہیں اور جو ملک جتنا زیادہ صنعتی ہوتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ طاقتور شمار کیا جاتا ہے، جیسے امریکہ، جرمنی، برطانیہ، فرانس، روس وغیرہ۔ زراعتی ملکوں کا کام محض یہ ہوتا ہے کہ وہ ان ممالک کے لئے کچا مال مہیا کرے۔ چین، آسٹریلیا، افریقہ، برازیل، کناڈا اور اسلامی ممالک حالانکہ بڑے بڑے ممالک ہیں لیکن ان کی اس لئے کوئی پوزیشن نہیں کہ وہ محض زراعتی ہیں اور صنعتی نہیں۔ زراعتی ممالک کو اپنی پیداوار صنعتی ممالک کے ہاتھوں بیچنا پڑتی ہے اور اس کے عوض انہی ممالک سے طیار شدہ مال خریدنا پڑتا ہے، لہذا ملک کی دولت کھنچ کھنچ کر باہر جاتی رہتی ہے اور نہ ان کے پاس سرمایہ اکٹھا ہوتا ہے اور نہ وہ صنعتی بن سکتے ہیں۔ غرضکہ یہ چکر چلتا رہتا ہے، اور ان کا افلاس اور غلامی قایم رہتی ہے۔

ہمارے بھائیوں کا خیال ہے کہ ہم سیاسی طاقت حاصل ہونے کے بعد صنعتی اور دولتمند ملک بن سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ خیال قطعاً غلط ہے سیاسی اقتدار سے کوئی ملک امیر نہیں بن جاتا۔ حکومت کے پیچھے سرمایہ داروں کی طاقت ہوتی ہے، جو اصل میں ہر حکومت کا ستون ہے۔ ہٹلر کی طاقت کا راز یہ تھا کہ صناع اور تاجر اس کی پشت پر تھے اسی طرح امریکہ کی طاقت کا بھی یہی راز ہے کہ امریکن سرمایہ دار، جسے ہم ہندوستان میں بنیا کہتے ہیں اُسکی پشت پر ہیں۔ حکومت امریکہ کی آمدنی کا ۳/۴ حصہ انڈسٹری کے ٹیکس ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں یہودیوں کے سرمائے سے چل رہی ہیں، اور برطانیہ اور امریکہ بھی یہودی سرمایہ داروں کا مقروض ہے۔ عرب، ایران، عراق، افغانستان، مصر وغیرہ کو تو سیاسی آزادی حاصل تھی اور ہے، لیکن وہ صنعتی اور طاقتور نہ بن سکے اس لئے کہ ان کی پشت پر سرمایہ نہیں۔ ہندوستان میں مغلوں کی طاقت کا راز یہ تھا کہ اس کی پشت پر ہندو بنیوں کا سرمایہ تھا، اور جس وقت وہ طاقت اس کی پشت پر سے ہٹی، مغلیہ حکومت کی ساری عمارت زمین پر آ رہی۔

لہذا غور کرنے کی بات ہے کہ آج دنیا کے کسی حصہ کے بھی مسلمان، صنعت و حرفت میں کیوں آگے نہیں — اس کا سبب وہی قومی خصوصیت ہے۔ سیاسی طاقت حاصل ہو جانے کے بعد یہ قومی خصوصیت نہ بدلے گی۔ مسلمان کی فطرت میں نہیں کہ وہ کوڑی کوڑی جوڑ کر اکٹھا کرے۔ لہذا پاکستان میں صنعت و حرفت قایم ہونے اور اس کے طاقتور ملک بننے کا کوئی امکان نہیں، آج مسلمانوں کو جن ملکوں میں سیاسی اقتدار حاصل ہے، وہاں بھی یہی گجراتی، مارواڑی اور سکھ چھائے ہوئے ہیں۔ کابل، طہران، عراق اور ریاست حیدر آباد میں جتنے بینک، انشورنس کمپنیاں کل کارخانے اور بڑی بڑی تجارتیں ہیں، وہ سب انہی ہندؤں اور سکھوں کے ہاتھ میں ہیں۔

پاکستان میں ضروری معدنیات مثلاً کوئلہ، لوہا وغیرہ کی عدم موجودگی کے سبب اس کے صنعتی بننے کا امکان اور بھی کم ہو جاتا ہے۔ اسوقت

اگر ہندوستان، کوئلہ بند کردے تو پاکستان کی ریلیں ایک منٹ میں بند ہو سکتی ہیں۔ پھر اس حالت میں انڈسٹری کس طرح چل سکتی ہے۔ حال میں ڈان، میں یہ خبر چھپی ہے کہ سندھ اور بلوچستان میں کوئلے کا پتہ چلا ہے۔ اگر بفرض محال اسے مان لیا جائے کہ ان مقامات پر بیشمار کوئلہ اور لوہا دبا پڑا ہے، تو بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ کوئلہ اور لوہا نکالنے کے لئے بھی سرمائے کی ضرورت ہے۔ عرصہ ہوا، افغانستان میں کوئلہ دریافت ہو چکا ہے، لیکن افغانستان کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ وہ زمین سے کوئلہ نکال سکے۔ عراق اور ایران کے پاس روپیہ موجود تھا، لیکن وہ تیل انکے کام نہ آسکا، بلکہ اینگلو پرشین آئل کمپنی نے اربوں کا سرمایہ لگا کر اسے نکالا۔ ابھی حال میں ابن سعود نے سوا لاکھ روپے روزانہ رائلٹی پر عربستان سے امریکی عرب آئل کمپنی کو تیل نکالنے کی اجازت دیدی ہے۔ غرضکہ اس سلسلہ میں پاکستان کے سامنے ہر قسم کی مشکلات ہیں، جن پر بغیر کسی بیرونی سرمائے کے پاکستان قابو نہیں پا سکتا۔ اور بیرونی سرمائے یا امداد کو دوسرے معنوں میں غلامی بھی کہتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان کے پاس چند نکڑ کی جگہیں ہوں گی، خاصکر درۂ خیبر کا راستہ اور کراچی کی بندرگاہ لیکن صرف نکڑ کی جگہیں ہونا کوئی چیز نہیں، جب تک اس نکڑ کی جگہ کو سنبھالنے کی طاقت بھی موجود نہ ہو۔ مصر کے پاس سوئز جیسی نکڑ کی جگہ ہے۔ ترکی کے پاس درۂ دانیال ہے۔ فلسطین خود نکڑ کی جگہ پر واقع ہے۔ لیکن ان مقامات پر ان بیچاروں کا اپنا قبضہ نہیں ہے۔ بلکہ ان نکڑ کی جگہوں کے سبب خواہ مخواہ ان کی جان مصیبت میں پڑ گئی ہے، بلکہ اگر یہ جگہیں ان کے پاس نہ ہوتیں تو وہ زیادہ آرام سے رہتے۔ صرف ترکی اب تک درۂ دانیال کا مالک بنا ہوا ہے لیکن درۂ دانیال کے سبب ترکی پر ہر قوم کی یورش ہے۔ روس اس پر دانت لگائے بیٹھا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ الگ اس کی فکر میں ہیں اور قرینہ ایسا ہے کہ سال دو سال کے اندر ترکی، درۂ دانیال سے محروم ہو جائے گا، یا تو روس اس پر قبضہ کر لیگا، یا پھر امریکہ و برطانیہ کی تحویل میں اسے دیدیا جائیگا اور اب بھی درۂ دانیال تقریباً بین الاقوامی مقام قرار پا چکا ہے، جسے ترکی نے بھی منظور کر لیا ہے۔

اسی طرح کراچی اور درۂ خیبر کی بڑی بڑی طاقتوں کو ضرورت ہے۔ روس جنوبی ایشیا میں بحیرۂ عرب اور بحیرۂ ہند میں زمانے سے ایک بندرگاہ کا متمنی ہے تاکہ دنیا کے اس حصے سے اس کا تعلق پیدا ہو جائے اور کراچی پر زمانہ سے اس کی نظر ہے۔ لہذا اسی لئے تحریک پاکستان کی روس کی طرف سے، اور مقامی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے حمایت کی جا رہی تھی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمان بہت جلد کمیونزم قبول کر لیں گے اور یہ بندرگاہ، روس کو مفت ہاتھ آجائے گی۔ لیکن اب نقشہ پلٹ چکا ہے اور پاکستان برطانوی سامراج کے تحت درجۂ نوآبادیات قبول کر چکا ہے، لہذا یہ کراچی کی بندرگاہ اور درۂ خیبر، روس کے رقیب امریکہ کو مل جائے گی، تاکہ وہ روس کے خلاف جنگ کے لئے کراچی کے بندرگاہ سے سامان لا سکے، اور صوبۂ سرحد کو اپنا فوجی اڈا بنا سکے۔ چنانچہ جب روس نے دیکھا کہ پاکستان انگریزوں کے پنجے میں چلا گیا، تو اب روس اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی دونوں کی طرف سے پاکستان کی پرزور مخالفت ہونے لگی ہے۔

پاکستان کے متعلق غلط فہمی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ نہایت ہوشیاری سے مغربی اور مشرقی پاکستان کو ایک ملک بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور انکا رقبہ، آبادی، آمدنی وغیرہ سب کے اعداد و شمار اکٹھا طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ حالانکہ قطعاً ہر لحاظ سے یہ دو الگ الگ ملک ہیں، جن کے درمیان کوئی تعلق نہیں اور ان کے مابین ایک ہزار میل کا فاصلہ ہے، اور جو کسی معاملہ میں بھی ایک دوسرے کو کسی قسم کی سہولت نہیں پہونچا سکتے، یا معاون و مددگار نہیں ہو سکتے۔ یہاں تک کہ مدافعت کے لئے بھی دونوں کو دو فوجیں رکھنی پڑیں گی۔ چونکہ یہ دونوں ممالک مسلمان ہیں۔ اس لئے انھیں

ایک ہی تصور کرنا سراسر حماقت ہے اور اگر ایسا ہی ہے تو سارے دنیائے اسلام کا رقبہ پاکستان میں شامل کرکے اسے دُنیا کا سب سے بڑا ملک بتلایا جاتا ہے۔ بنگال اور پنجاب کا جو نازک رشتہ ہے، وہ کب تک قایم رہ سکتا ہے، اور بنگال، پنجاب کے ساتھ، اور پنجاب، بنگال کے ساتھ خواہ مخواہ کب تک بندھا رہیگا؟ یہ آنے والا زمانہ ہمیں بتا دیگا۔

ساڑھے چار کرور مسلمان کیا کریں؟

مسلمانوں کو پاکستان کی جنت مل گئی اور اب بہت جلد تمام چیزیں عملی طور میں سامنے آجائینگی لیکن جہاں تک مسلم اقلیتوں کا معاملہ ہے، یہ بھی آخری طور پر طے ہو گیا کہ وہ اس جنت الفردوس میں داخل نہیں ہو سکتے انھیں اسی ہندوستان کے دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ حالانکہ ان ہی مسلم اقلیتوں کی مظلومیت کا رونا رو کر، پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا لیکن پاکستان بنایا گیا اُن علاقوں کا جو پہلے ہی سے مضبوط تھے یعنی مسلم اکثریتوں کے علاقے۔ لیکن جو کمزور تھے اور جنھیں محافظت کی ضرورت تھی، انھیں، علی حالہٖ ظالم، سفاک ہندوؤں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا گیا۔

حالانکہ اگر ہندوستان مشترک ہوتا، تو مرکز میں مشترک حکومت قایم ہوتی، جس میں مسلمان اراکین مساوی تعداد (Parity) میں موجود ہوتے اور سارے ہندوستان میں مسلمان دس کرور کی تعداد میں ہوتے اور اپنے مطالبات کو منوا سکتے تھے، لیکن اب ہندوستان میں مسلمانوں کی طاقت آدھی رہ گئی ہے۔ اور وہ کمزور ہو چکے ہیں۔ اڈیٹر فشور صاحب فرماتے ہیں کہ اگر پونے تین کرور مسلمان اپنے وجود کی حفاظت کا تہیہ کریں گے تو وہ اپنے مقصد میں ناکام نہ رہیں گے، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر دس کرور مسلمان ہندو اکثریت سے اپنی محافظت کے لئے کافی نہ سمجھے گئے اور ان کے لئے پاکستان کے قلعے کی ضرورت پڑی تو پونے تین کرور مسلمان اگر اپنے وجود کی حفاظت کا تہیہ کریں گے تو اپنی محافظت میں کس طرح کامیاب ہو جائیں گے؟ اللہ اکبر! شاید ہی دنیا کی تاریخ میں اتنی بڑی قوم کو اس طرح بیوقوف بنایا گیا ہو۔

لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ اگر چار کرور مسلمانوں کو بالآخر ظالم ہندوؤں ہی کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا تھا تو پھر ہندوؤں سے ان کے تعلقات اس درجہ کیوں خراب کرائے گئے، جن کے ساتھ انھیں ہمیشہ ہمیشہ زندگی بسر کرنا ہے۔ ہندوؤں سے اس قدر کشیدگی بڑھا دینے کے بعد اب ارشاد ہوتا ہے کہ انہی کے ساتھ رہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ظالم ہندو اب کس طرح اچھے بن جائیں گے۔

بہر حال یہ تو اب ظاہر ہو گیا کہ مسلم اقلیتوں کے مسئلے کا حل پاکستان نہیں۔ ہم جب پہلے کہا کرتے تھے تو لوگ یقین نہ کرتے تھے، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمارے بھائیوں کی سمجھ میں پالٹیکس اُس وقت آتی ہے، جب اصل حالات ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ وہ خطرے سے آگاہ کرنے پر چوکتا نہیں ہوتے کہا جاتا تھا کہ پاکستان ہندو مسلم سوال کا واحد حل ہے۔ لیکن پاکستان بن گیا اور نہ مسجد کے آگے باجے کا مسئلہ حل ہوا، نہ قربانی کا جھگڑا طے ہوا نہ ہندی اُردو کا سوال حل ہوا۔ غرضیکہ ہندو مسلمانوں کے تمام جھگڑے جوں کا توں ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہ موجود ہیں۔ یہاں تک کہ ہندو مسلم فسادات بھی اب تک نہ رُک سکے۔

اگر تعداد کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اکیلے یو۔پی کے ۸۵ لاکھ مسلمان صوبۂ سرحد، سندھ اور بلوچستان ان تینوں مسلم صوبوں کی مجموعی آبادی (۲۰ لاکھ) سے بھی زیادہ ہے۔ مغربی پنجاب جس کا اس قدر شہرہ ہے، اور جو پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی سمجھا جاتا ہے، اس کی آبادی یوپی کی مسلم آبادی سے کچھ ہی زیادہ ہے اکیلے مدراس کی مسلم آبادی (۳۸ لاکھ) سندھ اور صوبۂ سرحد دونوں سے بڑی ہے۔ اکیلے بہار کی مسلم قلیت

(۴۲ لاکھ) صوبۂ سندھ اور بلوچستان کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔ پھر اگر تعلیم، تہذیب اور تمدن کو لیجئے تو پنجاب، سندھ، یا بنگال کے مسلمانوں کو کسی طرح یوپی کے مسلمانوں پر فوقیت نہیں دیجا سکتی۔ یو۔پی اور بہار ہی نے ہندوستان میں اسلامی تعلیم پھیلائی اور آج بھی یہی صوبے اسلامی تہذیب کے بہترین مرکز ہیں، یہیں مسلم حکمرانی کے تمام آثار پائے جاتے ہیں، بڑے بڑے بزرگوں کے مزار ہیں، اور یہی خطہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ جدوجہد کی یادگار یعنی اُردو زبان کا مرکز ہے

لیکن اسلامی تہذیب و تمدن اور اُردو زبان کی محافظت کا دعویٰ کرنے والی جماعت نے، اسی خطے کو ہندو راج کے سپرد کردیا۔ بہرحال اب جو ہونا تھا وہ ہوچکا، پاکستان اچھا ہے یا بُرا، اب ہمیں اس سے بحث نہیں، وہ جانیں اور ان کا کام، لیکن ہندوستانی مسلمانوں سے سوال ہے کہ کیا وہ اسی طرح آئندہ بھی پاکستان کا بل بکرا بنتے رہیں گے یا خود اپنے لئے بھی جئیں گے؟ کیا آئندہ مسلمانوں کا سرمایۂ حیات محض یہ ہوگا کہ پاکستان کے متعلق اخباروں میں خبریں پڑھ کر اپنا دل خوش کر لیا کریں، شاید ہمارے بھائیوں کو اندازہ نہیں کہ آج وہ ایک جوالا مکھی پہاڑ کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کب یہ دہانہ پھٹ پڑے۔ اگر ان مسلمانوں نے اب بھی صحیح راستہ اختیار نہ کیا تو شاید ہندوستان سے مسلمان اسی طرح مٹ جائیں گے، جس طرح اسپین سے انکا خاتمہ ہوگیا۔

راستہ کیا ہے

سوال یہ ہے کہ راستہ کیا ہے؟ راستہ صرف ایک ہی ہے، یعنی اس ملک کو اپنا ملک سمجھنا، اور اس ملک کی اکثریت سے اشتراکِ عمل۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو ہجرت کرکے پاکستان نہیں جانا ہے اور اسی ملک کے اندر رہنا ہے تو آپ کو یہ پالیسی اختیار کرنی ہی پڑے گی۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ ہندوستان کے اندر مسلم لیگ کی پالیٹکس ختم ہوچکی۔ اب تو وہ دونوں صورت میں گئے۔ یعنی اگر وہ اپنے کو پاکستانی قوم کا ایک جزو کہتے ہیں تو ہندوستان کے تمام شہری حقوق سے محروم کردئے جائیں گے، اور اگر وہ اپنے ہندوستانی ہونے کا اعلان کریں گے تو پھر پاکستان کی حکومت کو ہندوستانی مسلمانوں کے معاملے میں دخل دینے کا حق نہ رہے گا اور انجمن اقوام کے سامنے یہ معاملہ ہندوستان کا گھریلو معاملہ قرار پائے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ اب مسلمانوں کا یہ عمل ہونا چاہئے کہ وہ پاکستان کو بھول جائیں دو قومی نظریہ کو ترک کردیں۔ ہر قسم کی فرقہ پرور انجمن بازی سے باز آجائیں، مشترکہ انجمن بنائیں، مخلوط انتخاب کے لئے جدوجہد کریں، اور ہندو فرقہ پروری سے لڑنے میں ہندو نیشنلسٹوں کی مدد کریں اور ہندوستان میں سوشلسٹ اسٹیٹ کے قیام کی کوشش کریں۔ (اقتباس از نئی زندگی)

نیاز فتحپوری کے قلم سے

تین جدید مطبوعات

مختارات نیاز۔ افسانوں کا چوتھا مجموعہ ۸ر

جھانسی کی رانی (ڈرامہ) ۸ر

اصحاب کہف (ڈرامہ) ۱۲ر

انشاؔ کے اطوار و اخلاق

حُلیہ انشاؔ کی جو تصویر میری نظر سے گزری ہے اس میں وہ وجیہ نظر آتے ہیں۔ کشادہ پیشانی، کتابی چہرہ۔ ستواں ناک۔ موٹی اور لانبی موچھیں جن کی نوکیں اوپر اُٹھی ہوئی ہیں، جسم نہ لاغر نہ فربہ۔ سینہ فراخ۔ کمر پتلی۔ بھرے بھرے بازو۔

میر علاء الدولہ اشرف علی خاں نے انشاؔ کو "جوان وجیہ بدل نزدیک"[1] لکھا ہے۔ نواب عنایت حسین خاں مہجور بنارسی نے ان کے متعلق :— "از زیور ظواہر و بواطن آراستہ"[2] — تحریر کیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے جس طرح انشاؔ کے کلام میں رنگا رنگی ہے اسی طرح وضع قطع میں بھی یکرنگ نہیں تھے چنانچہ مولوی قدرت اللہ شوق رامپوری ان کے حلیہ کے بارہ میں رقمطراز ہیں کہ :- "با صفائی چہار ابرو می ماند"[3]۔

مولوی محمد حسین آزاد نے اُن کی چال ڈھال اور سج دھج کے بارے میں جو رائے قایم کی ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ لکھتے ہیں :

"دیوان دیکھنے سے ان کے حالات و عادات کی تصویر سامنے کھچ جاتی ہے جبکہ وہ مشاعرہ میں آتے تھے یا دربار کو جاتے تھے۔ ایک طرف آداب معقولیت سے سلام کیا۔ ایک طرف مسکرا دیا ایک طرف منہ چڑھا دیا۔ کبھی مقطع مرد معقول کبھی دلی کے بانکے کبھی آدھی داڑھی اُڑا دی کبھی چار ابرو کی صفائی بنا دی"[4]

لباس انشاؔ کا لباس عام طور پر وہی تھا جو اس زمانہ کے دلی لکھنؤ کے شرفا کا ہوتا تھا لیکن ایک خصوصیت یہ تھی کہ اکثر گلے میں دوپٹہ ڈالے رہتے تھے جس کا ایک سرا آگے اور دوسرا پیچھے پڑا رہتا تھا۔[5]

آواز و لہجہ خوش لہجہ تھے۔ اشعار پڑھنے کا انداز بھی بہت دلکش تھا۔ چنانچہ اکثر اشخاص مشاعروں میں اپنی غزلیں انھیں سے پڑھواتے تھے۔[6]

---

[1] تذکرۃ الشعراء قلمی از میر علاء الدولہ اشرف علی خاں ورق ۳۶۲ الف تصنیف ۱۱۷۹ھ — [2] مدائح الشعراء قلمی (ورق ۸ ب) از نواب عنایت حسین خاں مہجور بنارسی تصنیف ۱۲۶۰ھ کتب خانہ ریاست رامپور

[3] کلمات الشعراء قلمی (ورق ۴۴ الف و ب) کتب خانہ سرکاری رامپور

[4] آب حیات طبع لاہور صفحہ ۲۸۴ — [5] آب حیات صفحہ ۳۲۴ — [6] آب حیات صفحہ ۲۸۴

ہمعصر تذکرہ نویسوں نے بھی ان کے لب و لہجہ کو بہت سراہا ہے۔ مولوی قدرت اللہ شوق رامپوری نے لکھا ہے:۔

"خوش تقریر بمرتبہ ایست کہ در تحریر نمی آید"[1]

مولوی عبدالقادر رامپوری جو لکھنؤ میں سید انشاء سے ملے تھے ان کے متعلق اپنے روزنامچہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"بزبان اُردو و فارسی و عربی و بنگالہ و پوربی و مرہٹی و کشمیری و ترکی و افغانی بہ لہجۂ آں قوم سخن گفتنی"[2]

فن سپہ گری ۔ "تیراندازی و شمشیربازی و سواری اسپ نیکو میدانست"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔[3]

علم مجلس ۔ "فن ہم نشینی شدن بجائے رسانیدہ بود کہ یکتائے زمانہ اش دریں کار او را تواں گفت۔۔۔۔۔"[4]

"مردیست ظریف الطبع بزلہ گو لطیفہ سنج کشادہ رو ہوشیار باش محبت دار خوش معاش۔۔۔۔۔"[5]

"جوانیست خوش ظاہر و خوش طبع"[6]

علم و فضل ۔ انشاء کے علم و فضل کی تعریف سب نے کی ہے، مخالفین نے بھی دبی زبان سے اعتراف کیا ہے، مثلاً قدرت اللہ قاسم نے انشاء کے بارہ میں لکھا ہے:۔

"ولے بقدر کفایت از علوم متعارفہ بہرہ اندوز است۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"[7]

اسی طرح مصحفی نے بھی لکھا ہے:

"تحصیل کتب عربیہ و فارسیہ و طب بقدر حال ہمہ دارد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"[8]

مولوی قدرت اللہ شوق رامپوری نے ان کی علمیت کو بہت سراہا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"جوانیست قابل صاحب استعداد کامل در فنون عربی و فارسی و ہندی مہارتے تمام دارد۔۔۔۔۔"[9]

نواب عنایت حسین خاں مہجور، بنارسی نے مندرجۂ ذیل الفاظ انشاء کی علمیت کے بارہ میں استعمال کئے ہیں:۔

"از زیور ظواہر و بواطن آراستہ و بجواہر زواہر علم و ہنر پیراستہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"[10]

فی البدیہہ کلام ۔۔ فی البدیہہ کلام کی بہت سی مثالیں صاحب "آبِ حیات" نے بیان کی ہیں مثلاً ایک مرتبہ رات کے وقت نواب سعادت علی خاں نے انشاء کو طلب کیا جس وقت انشا خدمت میں حاضر ہوئے اسوقت نواب ایک پہیہ دار چھپر کھٹ میں بیٹھے تھے۔ پھولوں کا گہنا سامنے رکھا تھا اور ایک گجرا نواب کے ہاتھ میں تھا جسے اُچھالتے تھے اور پاؤں کے اشارے سے

---

[1] تکملۃ الشعراء قلمی ۔ کتاب خانہ سرکاری رامپور۔۔۔ [2] روزنامچہ مولوی عبدالقادر رامپوری، قلمی کتب خانہ سرکاری رامپور۔۔
[3] روزنامچہ (ورق ۳۹ ب و ۴۰ الف) ۔۔۔ [4] روزنامچہ مولوی عبدالقادر رامپوری، قلمی کتب خانہ سرکاری رامپور۔۔۔ [5] مجموعہ نغز، از حکیم قدرت اللہ قاسم، جلد اول مطبوعہ لاہور۔۔۔ [6] تذکرۂ میر حسن صفحہ ۵۵ ۔ مطبوعہ لاہور۔۔۔ [7] مجموعہ نغز مطبوعہ لاہور۔۔۔ [8] تذکرہ ہندی کویاں مطبوعہ انجمن۔۔۔ [9] تکملۃ الشعراء قلمی تصنیف ۱۱۹۲ھ کتب خانہ سرکاری رامپور۔ [10] مدائح الشعراء قلمی تصنیف ۱۲۰۶ھ کتب خانہ سرکاری رامپور

چھپر کھٹ کو آگے بڑھاتے تھے۔ اسی حالت میں انشاء سے شعر گوئی کی فرمایش ہوئی، انشاء نے فوراً ہی یہ شعر موزوں کر کے پڑھا:۔

لگا چھپر کھٹ میں چار پہئے اچھالا تو نے جو لیکے بگرا تو موجِ دریائے چاندنی میں وہ ایسا جاتا تھا جیسے بجرا

اسی طرح ایک اور لطیفہ بیان کیا ہے جو قابل ذکر ہے۔ ایک روز نواب موصوف نواڑی میں لیٹے ہوئے دریا کی سیر کر رہے تھے۔ دریا کے کنارے ایک مکان پر یہ عبارت لکھی دیکھی۔ "حویلی علی نقی بہادر کی"

انشاء سے مخاطب ہو کر فرمایا کسی نے تاریخ کہی مگر نظم نہ کر سکا تم اسے نظم کر دو۔ اسی وقت میر موصوف نے رباعی عرض کی:۔

نہ عربی نہ فارسی نہ ترکی، نہ سم کی نہ تال کی نہ سر کی
یہ تاریخ کہی ہے کس لڑکی حویلی علی نقی بہادر کی،

ظرافت — یہ انشاء کی وہ اُفتادِ طبیعت ہے جس نے ان کے نام کو اور لفظ ظرافت کو مترادف بنا دیا ہے انکی کوئی چیز خواہ شاعری ہو یا محض ایک معمولی بات، ظرافت سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن انشاء ننگے سر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے نواب سعادت علی خاں کو مذاق سوجھا۔ انھوں نے پیچھے سے آکر ان کے سر پر ایک دھول رسید کی۔ انشاء نے چپ چاپ بغیر پیچھے دیکھے پگڑی سر پر رکھ لی اور بولے کہ بچپن میں بزرگوں سے سچ سنا تھا کہ ننگے سر کھانا کھانے سے شیطان دھولیں مارتا ہے۔ اسی طرح ایک اور لطیفہ سننے کے قابل ہے۔

نواب موصوف کا ایک روز مزاج برہم تھا۔ طرہ اس پر یہ کہ اُس دن نواب کا روزہ بھی تھا، چنانچہ تمام پہرہ داروں کو حکم دیدیا گیا کہ آج حضور میں کوئی آنے نہ پائے۔ اتفاقاً انشاء کو اسی روز ایک ایسی ضرورت لاحق ہوئی جو بغیر نواب کی مدد کے پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ پہونچے۔ پہرہ دار جانتے تھے کہ میر کو نواب کے مزاج میں کس قدر دخل ہے۔ اس لئے باوجود نواب کے حکم کے ان کو سختی کے ساتھ روکنا مناسب نہ جانا محض واقعہ سے آگاہ کر دیا۔ یہ بھی باوجود نواب پر حاوی ہونے کے نواب کی کیفیت مزاج سے خائف رہتے تھے۔ تھوڑی دیر تامل کیا لیکن اس کے بعد قبا اُتار ڈالی اور عورتوں کی طرح دوپٹہ اوڑھکر ناز و غمزہ کے ساتھ نواب کے سامنے جا پہونچے اور جونہی نواب کی نظر پڑی فوراً ناک پر اُنگلی رکھکر بولے:۔

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

نواب بے اختیار ہو کر ہنسنے لگے اور انشاء کو جو منظور تھا اس کی کار برآری نواب سے ہو گئی۔ لطائف و ظرائف کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ایسی ہیں جن سے انشاء کی کیفیت مزاج اور رجحان طبع کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً علی نقی بہادر جو زیڈنسی لکھنؤ کے میر منشی تھے، جب رخصت ہونے لگتے تو انشاء کہا کرتے کہ "منشی صاحب کا اللہ بیلی" اس جملہ میں رعایت یہ ہے کہ اس زمانہ کے رزیڈنٹ کا نام جان بیلی تھا۔ لکھنؤ کا "بیلی گارڈ" آج بھی ان کے نام کی یاد دلاتا ہے۔ اسی طرح جب انشاء دہلی میں تھے تو سرکار شاہی میں جو حافظانِ قرآن ملازم تھے اُن میں سے ایک صاحب سے ان کی بھی بے تکلفی تھی۔ حافظ موصوف کا نام "احمد یار" تھا۔ جب وہ انشاء سے ملکر رخصت ہوتے تو یہ کہا کرتے تھے۔ مصرع:۔ "اللہ حافظ احمد یار"[1]

---

[1] مزید لطائف کے لئے دیکھئے "آبِ حیات" محمد حسین آزاد حالات انشاء

بات بے سوچے بھی کہہ جاتے تھے ۔۔ انشاء کے مزاج میں یہ چیز بہت اہم ہے۔ ان کی شخصیت اور آگے چلکر ان کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اس بات کا مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ ان کی طبیعت کی یہی اُفتاد دربار اودھ میں رسائی کا باعث ہوئی۔ اور یہی دربار سے نکلوانے کا بھی سبب ہوئی "آبِ حیات" میں مذکور ہے کہ دربار میں رسائی سے قبل انشاء علامہ تفضل حسین[1] خاں سے ملنے جایا کرتے تھے علامہ چونکہ خود بھی علم و فضل میں پایہ رکھتے تھے اس لئے دیگر اہل علم و فضل کی بھی قدر و منزلت فرماتے تھے۔ انشاء سے اُنھیں خاص دلچسپی تھی اور اس فکر میں تھے کہ کسی طرح اُنھیں سعادت علی خاں کے دربار تک پہونچا دیں۔ اتفاقاً ایک روز علامہ کی مجلس میں سید انشاء ایک ایسا لفظ بول گئے جو مہذب صحبت میں بولنے کے قابل نہیں تھا کہنے کو تو کہہ گئے مگر بعد میں علامہ کی نظر تاڑ کر بولے کہ مارواڑی زبان میں اس لفظ کے معنے "بیوقوف" کے ہیں۔ علامہ نے جواب دیا "خیر خانصاحب انداز معلوم ہوگیا۔ انشاء اللہ جلد کوئی صورت ہو جائے گی"۔ دوسرے ہی دن نواب اودھ سے ان کی شرافت خاندان اور ذاتی کمالات کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ کی صحبت ان کا ہونا شغل صغریٰ و کبریٰ سے بہتر ہوگا نواب سنکر مشتاق ہوئے۔ ایک دن بعد علامہ موصوف انشاء کو اپنے ساتھ دربار لے گئے۔ وہاں پہونچکر یہ نواب سے ایسا شیر و شکر ہوئے کہ نواب کو بغیر ان کے ایک لمحہ گزارنا بھی دشوار ہوتا تھا۔

مگر جب تقدیر نے پلٹا کھایا تو وہی چیز جو دربار میں لانے کا سبب ہوئی تھی دربار سے نکلوانے کی بھی وجہ ثابت ہوئی۔ صاحبِ "آبِ حیات" نے بیان کیا ہے کہ ایک روز نواب کے دربار میں مختلف لوگوں کی نجابت و شرافت کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں نواب بولے کہ کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں۔ انشاء یکدم بول اُٹھے بلکہ انجب۔ انھوں نے اپنے خیال میں اسم تفضیل کا صیغہ لگا کر نواب کی شرافت کو اور بھی چمکانا چاہا تھا۔ لیکن جلدی میں یہ خیال نہیں کیا کہ عربی زبان میں لفظ "انجب" باندی بچہ کے لئے مخصوص ہے جیسا کہ کہا گیا ہے کہ "ولد الجاریۃ انجب" اور مثل مشہور ہے کہ سچا مذاق سب کو بُرا لگتا ہے۔ نواب دراصل حرم کے بطن سے تھے اس لئے انشاء کی بات سارے حاضرین دربار پر مع نواب کے بجلی کی طرح گری اور سب سناٹے میں آگئے۔ اس کے بعد انشاء نے ہزار ہزار باتیں بنائیں لیکن جو کچھ جلد بازی میں زبان سے نکل گیا تھا اسے نہیں بنا سکے۔ یہیں سے نواب کی انشاء سے شکر رنجی ہوتی ہے اور آخر میں یہی واقعہ ان کے زوال اور نظر بندی کا سبب ہوا۔ یہ وہ قید تھی جس سے انشاء کو قیدِ حیات کے ساتھ ہی چھٹکارا ملا۔

مذہب ۔ انشاء آبائی مذہب کے اعتبار سے شیعہ مسلمان تھے لیکن درحقیقت بذات خود ان کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ایک تذکرہ نویس کے الفاظ ان کے بارہ میں قابل توجہ ہیں:۔

"مرد یست آزاد مشرب از قید مذہب وارستہ و طور آزادانہ با صفائی جہا بر وی ماند"[2] رحمت نبی خاں ام۔ اے (علیگ)

---

[1] تفضل حسین خاں علامہ۔ فاضل اجل ہونے کے علاوہ حکومت اودھ اور حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کی نظروں میں بہت معزز تھا اور ان دونوں ایوانان حکومت میں اسکا بڑا اثر تھا۔ [2] تکملۃ الشعراء قلمی از مولوی قدرت اللہ شوق رامپوری ۱۱۹۲ھ کتب خانہ سرکاری ریاست رامپور۔

ہندسوں کی ایجاد و ترقی پر ایک تحقیقی تبصرہ

اپریل ۴۶ء کے نگار میں مستفسرانہ طریق پر یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ موجودہ ہندسوں کا (جن کو عربی ہندسے کہتے ہیں) ماخذ سامی ہو سکتا ہے۔

اڈیٹر صاحب کا ممنون ہوں کہ اُنھوں نے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے نتیجہ کے طور پر یہ تحریر فرمایا کہ :-

"عرب کے مصنفین ہندوستانی ہندسوں کی تقدیم کے قایل تھے" اور یہ کہ "عربوں نے علاماتِ شمار ہندوں سے حاصل کئے"۔

اِن دونوں نتیجوں سے سرِ دست اختلاف کرنے کی کوئی وجہ یا ضرورت میرے پیشِ نظر نہیں۔ میں اُن کو اس معنی میں لیتا ہوں کہ اہلِ ہند نے علامات شمار قایم کرنے کا نیا طریقہ ایجاد کیا اور یہ کہ اہلِ عرب نے اُسی طریقہ کو اختیار کیا۔

میرا استفسار علاماتِ شمار کی اشکال سے متعلق تھا۔ یہ دونوں باتیں یعنی علاماتِ شمار کے قایم ہونے کا نیا طریقہ اور علاماتِ شمار کی اشکال بہت وضاحت چاہتی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ پہلے حروف و اعداد کی پیدایش اور نشوونما کی عام تاریخ پر ایک نظر ڈال لی جائے اور پھر مسئلہ پر غور کیا جائے۔

کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے انسان نے نام سیکھے۔ ناموں کی ذیل میں ایک - دو - تین وغیرہ گنتی کے الفاظ بھی آتے ہیں جن کو سب سے پہلے انسان نے اپنے جانوروں اور خاندان کے آدمیوں کو شمار کرنے کے لئے ضرورتاً ایجاد کیا ہوگا۔ یہ امر بھی قیاس میں آسکتا ہے کہ دیگر تصورات کے طریقۂ یادداشت سے پہلے انسان نے شمار کی یادداشت کے طریقے ایجاد کئے۔ یعنی حروف کی ایجاد سے پہلے الفاظِ شمار کی علامتیں ایجاد ہوئی ہوں گی جن کو ہم اعداد کہتے ہیں۔

تحقیق سے یہ بات ثابت ہے کہ اعداد کی یادداشت کے جو ابتدائی طریقے رائج تھے وہ کھڑی یا سیدھی لکیروں یا بھرے ہوئے اور خالی گول نقطوں کی صورت میں تھے۔ لیکن یادداشت کے طریقے جاری ہونے سے پہلے ضروری تھا کہ گننے کا کوئی آسان طریقہ مقرر ہو جاتا۔ اور یہ آسان طریقہ خود انسان کے ہاتھ پاؤں اور خصوصاً ہاتھوں کی اُنگلیاں تھیں۔ چنانچہ ایک قدیم قوم میں پانچ کے مفہوم کا لفظ "ایک ہاتھ" تھا۔ دس کو "دو ہاتھ" سے ظاہر کرتے تھے اور پندرہ کو "دو ہاتھ اور ایک پیر" کہتے تھے۔ آج بھی گونگے اشخاص ہر ہاتھ پاؤں کی اُنگلیوں سے تعداد ظاہر کی جاتی ہے۔ اسی طرح پیمایش میں بھی یہی ہاتھ پاؤں کام میں لائے جاتے تھے، اب بھی لائے جاتے ہیں اور اس میں شک نہیں

کہ ہاتھ کی اُنگلیوں کی تعداد نے گنتی کے طریقہ پر بڑا اثر کیا۔ وہ اس طرح کہ جب کوئی چیز گنی جاتی تھی تو دس اُنگلیوں تک پہونچکر پھر نئے سر سے انگلیاں شمار کرنا ہوتی تھیں۔ مثلاً پندرہ کی تعداد پر اس طرح پہونچتے تھے کہ پہلے دس گنے اور پھر دس کے اوپر پانچ اُنگلیاں شمار کی گئیں۔ اس طور پر فی الحقیقت آیندہ کے لئے دس کا عدد ایک منزل قرار پاگیا جس کے آگے کی منزلیں اُسی قدر اور اُسی طرح فاصلہ طے کرنے کے بعد حاصل ہو سکتی تھیں۔ پس ابتدائی علامتیں دس تک محدود ہوگئیں۔ جب کاروبار کی ضرورتوں نے علامتوں کو وسعت دینا چاہی تو ایک سو کی منزل پر پہونچکر اُس کی ایک خاص علٰحدہ علامت مقرر کرنا پڑی اور اُسی طرح ہزار کی۔ ممکن ہے کہ اگر انسان کے ہاتھوں میں کم یا زیادہ اُنگلیاں ہوتیں تو آج حساب کا طریقہ بھی کچھ اور ہوتا۔

یہ سب باتیں تاریخی زمانہ سے پہلے کی ہیں۔ قدیم زمانہ میں اعداد سے متعلق جو کیفیت مختلف ملکوں میں پائی جاتی تھی حسب ذیل ہے:۔

مصر میں مسیح سے ساڑھے تین ہزار برس قبل حسب ذیل علامتیں تھیں:۔

ایک = | - دس = ∩ - سو = 𓆼 - ہزار =

عراق میں ساڑھے تین ہزار برس قبل مسیح یہ علامتیں تھیں:۔

ایک = (𒁹) - دس = (𒌋) - ساٹھ = (𒐐) - چھ سو ساٹھ = (𒐐𒁹)

چونکہ ہمارا مضمون زیادہ تر عراقی علم الاعداد سے متعلق ہے اس لئے عراقی طریقۂ حساب کی مزید وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ طریقۂ مذکور یہ تھا کہ ایک کے ہندسہ کو دوہرا کر کے نو تک کے اعداد بنائے جاتے تھے۔ دس کی ایک علٰحدہ علامت مقرر تھی۔ دس سے آگے کے ہندسے ایک اور دس کی علامت کو کمر رسہ کر جوڑ کر بنائے جاتے تھے۔ مثلاً تیئیس (۲۳) کا عدد لکھنا ہوتا تو یوں بنایا جاتا تھا (𒐐𒁹𒁹 / 𒌋𒌋𒌋) - جب اس طرح شمار کی نوبت ساٹھ تک پہونچتی تو ساٹھ کا ہندسہ ایک کے ہندسہ پر لکیر بڑھا کر قایم کیا جاتا۔ اور آیندہ اعداد کی تعمیر کے لئے یہی ساٹھ کا ہندسہ بنیاد قایم ہو جاتا جس طرح آج کل کے طریقۂ حساب میں دس کا عدد بنیادی عنصر ہے اور طریقۂ مذکورہ اعشاریہ کہلاتا ہے اُسی طرح عراقی طریقہ شصتیہ (۶۰ والا) کہلاتا ہے۔

دونوں طریقوں میں جو فرق ہے اُس کو چھ سو ساٹھ کے عدد کی ترتیب و ترکیب ساخت سے سمجھا جا سکتا ہے، مثلاً اگر دس کے عدد کو عنصر قرار دیا جائے تو اُس کی تشریح اس طرح پر ہوگی۔ پہلا خانہ خالی یعنی صفر۔ دوسرا خانہ دہائی کا چھ کے عدد کو دس کے عدد سے ضرب دیا جائے گا تو حاصل ضرب (۶۰) ہوگا۔ تیسرا خانہ سیکڑہ کا ہے۔ چھ کے عدد کو (۱۰ × ۱۰) سے ضرب دیکر (۶۰۰) کا عدد حاصل ہوگا۔ ان تینوں (یعنی صفر + ۶۰ + ۶۰۰) کو جوڑنے پر (۶۶۰) کا عدد ہو جائے گا۔ عراقی ہندسہ (۶۶۰) کا اس طرح (𒐐𒌋) لکھا جاتا تھا۔ اس میں پہلے ساٹھ کے ہندسہ کی شکل ہے

اور پھر دس کے ہندسہ کی - ساٹھ کے ہندسہ کی ترکیب ساخت اُسی طرز کی تھی جیسی اب دس کے عدد کی ہے یعنی جس طرح دس کے عدد کی ساخت یہ ہے کہ پہلے صفر اور پھر دہائی کے ایک کو دس گنا کر کے دونوں کو جوڑ لیا جاتا ہے اُسی طرح ساٹھ کے ہندسہ کی ترکیب ساخت یہ تھی کہ پہلے صفر اور پھر ایک کو ساٹھ سے ضرب دیکر دونوں کو جوڑ لیا جاتا تھا جیسے {صفر + (۶۰) ۱ = ۶۰} - اسی ڈھنگ پر (۲۷ -) کی تشریح اس طرح ہوگی {صفر + (۶۰) ۱ + (۶۰) ۱۰ = ۶۶۰} - ساٹھ کے عدد میں جو لکیر ہے وہ صفر کا کام دیتی تھی -

صفر کے معنی خلا، خلا کی علامت اور محض علامت کے ہیں جس طرح اب Zero یا نقطہ، صفر کی علامت ہے اُسی طرح عراق میں لکیر سے کام لیا جاتا تھا - اس لئے یہ کہنا کہ ہندوستان میں شُنّ (علامت خلا کی) ایجاد سے پہلے صفر کی علامت ایجاد نہیں ہوئی تھی یا اعداد میں صفر (خلا) کا احساس نہیں ہوا تھا غلط ہے - خلا کا احساس ہونا لابدی امر تھا کیونکہ اُس قدیم زمانہ ہی میں یعنی کئی ہزار برس قبل مسیح جوڑ - باقی - ضرب وغیرہ کرنے کا ایک آلہ طیار ہو چکا تھا جس کی مدد سے فوری معلومات حاصل کرنے کے لئے جدولیں اور نقشے مرتب رکھے جاتے تھے - یہ آلاب بھی بچوں کو گنتی سکھانے کے لئے مدرسوں میں رائج ہے - یہ آلہ مستقل طور پر کام دینے کے لئے لکڑی کے چوکھٹے میں تیلیاں یا ڈوریاں ڈالکر طیار کیا جاتا تھا یا عارضی طور پر لکڑی کے تختہ پر مٹی - ریت وغیرہ بچھا کر یا کھڑیا سے نقشہ طیار کر کے کام لیا جاتا تھا - ملاحظہ ہو شکل ذیل :-

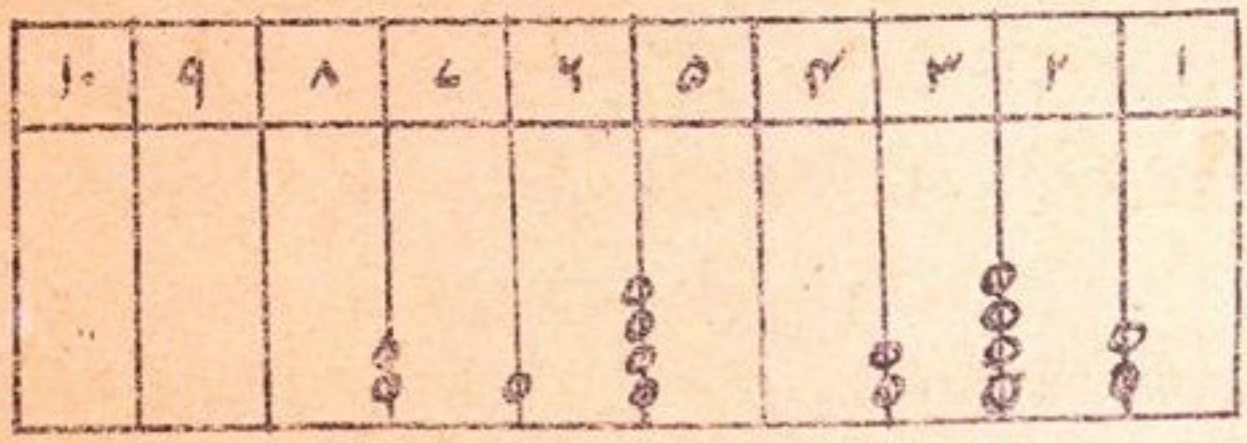

اس آلہ کی نمبروار تیلیوں سے کام اس طرح لیا جاتا تھا کہ گنتی کی ضرورت کے لحاظ سے اُن میں تسبیح کی طرح دانے یا کوڑیاں پرو دیجاتی تھیں - ہر تیلی میں کئی دانوں کی گنجائش ہوتی تھی - مثلاً نو تک کی گنتی کی صورت میں تیلی سے یعنی اکائی کی تیلی میں نو تک دانے پروئے جا سکتے تھے - دس سے عدد تک نوبت پہونچنے پر سے - (دہائی کی) تیلی میں ایک دانہ ڈالدیا جاتا تھا اور اُس سے زاید کے لئے ہر دس کے پیچھے نوے کے عدد تک مزید دانے پرو دئے جاتے تھے - غرضکہ ہزار در ہزار تک کی گنتی اس طرح کر لی جاتی تھی - شمار کرنے میں یہ بھی ممکن تھا کہ کبھی کسی تیلی میں کوئی دانہ ڈالنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تو اُس وقت وہ تیلی خالی رہتی تھی - زبانی حساب کتاب میں تو خلا کا احساس نہیں ہو سکتا تھا لیکن آلۂ شمار کے استعمال کے وقت اس کا احساس ضروری تھا —— قدیم اہل عراق نے اس احساس کو لکیر کی شکل میں ظاہر کیا اور اُس سے صفر کا کام لیا

لیکن ایک خامی رہ گئی یعنی وہ اس صفر کو اعداد کے درمیان میں تو کام میں لاتے تھے لیکن اخیر میں یعنی اکائی کی جگہ شاذ و نادر ہی استعمال میں لاتے تھے اسلئے جو کام اب صفر سے لیا جاتا ہے وہ پورے طور پر اُس لکیر سے نہ لے سکے اور باوجودیکہ وہ اپنے ہندسوں سے ضرب۔ تقسیم وغیرہ کر لیتے تھے وہ کی قدر و قیمت کی تعیین نہ کر سکے۔ ایک سے نوے تک کے اعداد کو بھی وہ علٰحدہ علٰحدہ شکل نہ دے سکے اور یوں وہ علم الحساب کے کوئی خاص قواعد و ضوابط مقرر نہ کر سکے۔

یہ باتیں علم حساب کی آیندہ ترقی کے مدارج سے متعلق ہیں۔ سر دست یہ بات ذہن میں رکھنے کے قابل ہے کہ قدیم اہل عراق مسیح سے تین چار ہزار سال پہلے ہندسے اور صفر ایجاد کر چکے تھے اور آلہ شمار کی مدد سے جو تعداد اکائی سے شروع کر کے دہائی اور سیکڑوں کی جانب قایم کرتے تھے اُسی طرح بولتے بھی تھے۔ مثلاً احد ثلاثین مائتین والف (اکتیس، دو سو اور ہزار) جس کو ہم آج ہزار کی طرف یعنی اُلٹی طرف سے شروع کر کے ایک ہزار دو سو اکتیس پڑھتے ہیں۔ ہندی طریقہ بھی پہلے سیدھی طرف سے پڑھنے کا تھا جس کی یادگار چھوٹے اعداد مثل بچپیں۔ اڑتیس وغیرہ ہیں جو اب بھی پہلے اکائی اور پھر دہائی کے لحاظ سے بولے جاتے ہیں لیکن جب اُلٹی طرف سے لکھنا شروع نہ ہوا اور حساب کتاب میں ترقی ہوئی تو ہندسے بھی بائیں جانب سے پڑھے جانے لگے۔

حال میں ہندوستان کے اندر مہنجو دارو اور ہڑپا میں قدیم زمانہ کے کچھ برتن۔ مہریں اور تصویر برآمد ہوئے ہیں اور ان پر ایسے نقش و نگار پائے گئے ہیں جن کو از قسم تحریر ہونا قرار دیا گیا ہے۔ اُنھیں میں کچھ اعداد کی علامتیں بھی بتائی جاتی ہیں۔ ان آثار کا زمانہ مسیح سے ڈھائی تین ہزار برس قبل کا اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ عراق کے قدیم مقامات میں بھی ایسی ہی مہریں برآمد ہوئی ہیں۔ کتابت پڑھنے کی کوشش کی گئی، لیکن ابھی تک یہ معمہ حل نہیں ہوا، یہی کیفیت اعداد سے بھی متعلق ہے لیکن قیاسِ غالب یہی ہے کہ نقش و نگار میں جو لکیریں حسب ذیل شکل کی پائی جاتی ہیں وہ اعداد سے متعلق ہیں :- ا — ۱۱ — ۱۱۱ — ۱۱۱۱ — ||||| ||||| ||||| ||||| |||||

مہنجو دارو کی کتابت دو قسم کے نقوش پر مشتمل خیال کی گئی ہے۔ ایک تو مصر و عراق کی طرح جانوروں وغیرہ کی تصویریں اور دوسری ایسی مفروضہ شکلیں جو کسی ذہنی تصور یا لفظ کی علامت ہوں ——— اس تحریر کی کتابت سیدھی طرف سے اُلٹی طرف ظاہر کی جاتی ہے لیکن بعض اوقات جب سیدھی طرف سے لکھتے ہوئے سطر ختم ہو جاتی ہے تو دوسری سطر وہیں سے اُلٹی جانب لکھی ہوئی پائی جاتی ہے۔ اُلٹی جانب سے لکھتے وقت علامات یا تو ویسی ہی لکھی ہوئی پائی جاتی ہیں جس طرح سیدھی طرف سے لکھی جاتی تھیں لیکن بعض دفعہ وہ منعکس شکل میں نقش کی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ ان نقوش کی صوتی اور معنوی کیفیت کیا ہے۔ اس امر کے متعلق بھی کوئی معلومات نہیں کہ مہنجو دارو کب ویران اور برباد ہوا۔

جس زمانہ کا حال اوپر درج کیا گیا ہے اگر اُس کو دور اول قرار دیا جائے تو دوسرا دور وہ آتا ہے جب تجارت پیشہ

سامی فنیقی قوم نے عراق اور مصر کی کتابتوں سے حروف اخذ و ایجاد کر کے اطرافِ عالم میں پھیلائے اور اپنے وسیع کاروبارِ تجارت کے سلسلہ میں اجنبی قوموں کو علم حساب سے بھی روشناس کرایا۔ فنیشیا ملک شام کا وہ جنوبی علاقہ ہے جو کوہ لبنان اور بحرِ روم کے درمیان واقع ہے۔ عراق کی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ ملک شام معہ اس علاقہ کے عراق کی ماتحتی میں عہدِ سے تقریباً چار ہزار برس پیشتر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اہل فنیشیا تجارت کے سلسلہ میں ہسپانیہ اور انگلستان تک پہونچ چکے تھے۔ بحرِ روم کے کنارے انھوں نے متعدد نو آبادیاں قایم کرلی تھیں اور یونان اور اُسکے آس پاس کے جزائر مدتوں اُن کے زیر اثر رہے۔

حروف کی ایجاد کا زمانہ تقریباً دو ہزار برس قبل مسیح قیاس کیا جاتا ہے۔ چنانچہ نئے حروف تقریباً ایکہزار سال قبل مسیح پہلے یونان پہونچے اور اُس کے بعد اٹالیہ میں۔ (ملاحظہ ہوں الفاظ الفا۔ بیٹا۔ تہٹیا حروف یونانی اور رومی حروف A.B.C.D اور K.L.M.N. Q.R.S.T. بمقابلہ ابجد۔ کلمن اور قرشت کے)۔

حروف کے ساتھ ساتھ علم الحساب بھی جتنی کہ ترقی کر چکا تھا یونان پہونچا۔ حال کی ایک گرانمایہ جدید تصنیف L. Hogben فنیشیا Mathematics for the million میں سے بھی اسکی تصدیق ہوتی ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ جب اقوام آریہ ۱۰۰۰ ق۔م کے قریب یونان میں داخل ہوئیں تو اُن کی اصل زبان وہی تھی جو مختلف ممالک میں داخل ہونے والے دیگر اقوام آریہ کی تھی لیکن اُس وقت تک وہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور نہ اعداد سے واقف تھے اور نہ وہ ناپ تول جانتے تھے۔ یہ سب باتیں اُنھوں نے اہلِ فنیشیا سے حاصل کیں۔"

یہی حال ملک ایطالیہ کا ہے۔ کہتے ہیں کہ شہر روم ۷۵۳ ق۔م آباد ہوا تھا جس کے معنی یہ ہوئے کہ اُس ملک میں بھی اقوام آریہ ہزار آٹھ سو سال قبل مسیح داخل ہوئی تھیں۔ اُن سے پہلے جو نسل وہاں آباد تھی اولاً اُس نے اہل فنیشیا سے سیکھا اور پھر اُن کی معلومات سے رومیوں نے فایدہ اُٹھایا اور یونان کے فضل و کمال اور چھٹی صدی قبل مسیح سے ارسطو کے عہد تک کا زمانہ تیسرا دور ہے۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے شروع ہونے سے قبل اہل فنیشیا اور دیگر سامی اقوام مثلاً بنی اسرائیل میں ایک جدید طریقۂ حساب جاری ہو چکا تھا۔ وہ یہ کہ حروفِ ابجد کی قیمت قایم کر دی گئی تھی، یعنی ایک کی علامت کسی حرف سے مقرر کر کے اُسی کو دوہرانے سے نو تک کے ہندسے بنائے جاتے تھے۔ اور دس کی علامت کا پھر کوئی حرف مقرر کر کے اُس کی تکرار سے بیس تیس وغیرہ نوے تک اعداد بنائے جاتے تھے۔ غرضکہ اس طرز پر سو اور ہزار وغیرہ کی علامات حروفی قایم کر کے آگے کے اعداد مہیا کئے جاتے تھے۔ یہی طریقہ یونانیوں اور اہل اطالیہ نے اختیار کیا۔ ملاحظہ ہوں یونانیوں کے اعدادِ جمل:-

α - θ - κ - ε θ - ρ

۱ ۹ ۲۱ ۶۹ ۱۶۹

اہلِ اطالیہ نے اس طریقے میں کچھ ترمیم کر دی - طریقۂ مذکور دونوں ہاتھوں کی دس انگلیوں پر مبنی تھا - اہل اطالیہ نے صرف ایک ہاتھ کی پانچ انگلیوں کو اساس قرار دیکر اکائی کے ہندسے یوں تجویز کئے :-

ا - ۱۱ - ۱۱۱ - $\frac{1111}{17}$ - ۷ - ۷۱ - ۷۱۱ - وغیرہ - پانچ کی علامت انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کی ملی ہوئی شکل ہے - اکائیوں کے آگے کے ہندسے دس - پچاس - سو - ہزار وغیرہ حروف میں قایم کئے گئے اور چونکہ سکندر کے بعد رومی تمام یورپ پر حاوی ہو گئے تھے اس لئے تمام یورپ میں اُنھیں کے حروف اور ہندسے جاری ہو گئے - حروف تو اب تک جاری ہیں لیکن ہندسے بھی سیکڑوں برس تک جاری رہے اور جب مسلمان اہلِ عرب نے نئے ہندسے رائج کئے تو عیسائیت نے مدتِ مدید تک اُن کا استعمال ناجایز قرار دیکر ترقی کا دروازہ بند رکھا - لہذا ہم پھر یونانی دور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں - ظاہر ہے کہ جو طریقہ یونانیوں نے اختیار کیا تھا وہ کسی ترقی کا حامل نہ تھا کیونکہ حروفی اعداد سے حساب لگانے کے درجات طے کرنا (جس کو انگریزی میں Calculate کرنا کہتے ہیں) محال تھا - اس لئے فیثاغورس وغیرہ کے ہاتھوں علم الاعداد ایک مقدس راز بنکر رہ گیا اور مسایل نے معموں کی صورت اختیار کر لی - فیثاغورس، فنیشیا کے صدر مقام شہر صور کا رہنے والا تھا - اسی طرح طالیس بھی ایشیائے کوچک کے ایک ساحلی شہر کا باشندہ تھا - اہلِ یونان نے اُن کو بلا کر اپنے یہاں رکھا تھا - مگر یہ لوگ علم حساب میں کچھ نمایاں ترقی نہ کر سکے اور اس دور میں بھی صفر اور اعداد کا وہ استعمال جو آجکل جاری ہے دریافت نہ ہو سکا باوجود اس کے کہ ہندسوں میں تبدیلیاں ضرور ہوتی رہیں جیسا کہ شامی ہندسے ظاہر کرتے ہیں - یہ ہندسے دوسرے دور کے آخر اور تیسرے دور کے شروع میں یعنی عیسےٰ سے ہزار آٹھ سو سال قبل ملک شام میں رائج ہونا پائے جاتے ہیں - نمونہ ملاحظہ ہو :-

ایک = ا - دو = ۲ - تین = ۲۱ - چار = ۲۲ -

تیسرے دور کا بیان ختم کرنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم پھر عراقی سلسلہ کی طرف متوجہ ہوں اور آریہ اقوام کی تیسری شاخ کا ذکر کریں جو عیسےٰ سے بارہ پندرہ سو سال پہلے ایران میں داخل ہوئی تھی - یوں تو عراق کی قدیم ترین قوم سُمیری اور مہنجو داڑو کی رہنے والی قوم میں کچھ نسلی اتحاد خیال کیا جاتا ہے اور عراق کی بعد کی سامی قوموں اور پنجاب کے اُس علاقہ کے درمیان جہاں بلوچستان اور ہندوستان کی سرحد پر مہنجو داڑو واقع ہے تجارت کا سلسلہ رائج ہونا تسلیم کیا جاتا ہے لیکن جب ایرانی آریوں نے چھٹی اور پانچویں صدی قبل عیسیٰ میں عراق پر غلبہ حاصل کیا اور اُس کے بعد پنجاب کو بھی اپنے تصرف میں لائے تو صورت اور بھی بدل گئی — ایرانی آریوں کی کتاب اَوِستا اور ہندوستانی آریوں کی کتاب رگوید کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں شاخوں کی زبان تقریباً ایک تھی - کہا جاتا ہے کہ کتاب اَوِستا زیادہ سے زیادہ ۱۰۰۰ ق - م کے آس پاس کی تصنیف ہے اور اُس کا ایک نسخہ بیلوں کے چمڑوں پر لکھا ہوا سکندر کے حملہ کے وقت موجود تھا اور اُنھیں ایام میں ضایع ہو گیا - (نوٹ : پروفیسر براؤن اور بعض دیگر مصنفین اَوِستا کی تصنیف کو چھٹی یا ساتویں

صدی قبل عیسیٰ سے منسوب کرتے ہیں) ساسانی حکومت کے آغاز میں کتاب مذکور کا حفاظ کی مدد سے از سرِ نو قدیم کتابت میں مرتب ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ یہ کتابت دائیں جانب سے بائیں سمت ہے اور اُس کے جو حروف ہیں وہ عراقی کتابت سے ماخوذ ہونا تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اسی طرح فارسی کی اُس شاخ کی کتابت ہے جو کیخسرو اور دارا کی زبان تھی وہ بھی عراقی کتابت سے رنڈ کی گئی تھی اور سیدھی طرف سے لکھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک تیسری کتابت تھی جس کو پہلوی کہتے ہیں۔ اِس کے حروف بھی عراقی کتابت سے حاصل کئے گئے تھے اور سیدھی طرف سے لکھے جاتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ ایران میں داخل ہونے والے آریہ فرقے بھی فن تحریر سے نابلد تھے اور اُنھوں نے بھی اُس وقت عراقی کتابت سے حروف حاصل کئے جب اُن کا تصادم اور اتصال عراقی اقوام سے ہوا۔ اس زمانہ کی بھی تعیین ساتویں آٹھویں صدی قبل عیسیٰ یا اُس کے تھوڑے عرصہ بعد ہی کی جا سکتی ہے۔ خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ پہلوی کتابت نے یہاں تک سامی زبان سے استفادہ کیا کہ سامی الفاظ اپنی کتابت میں لیکر اُن کو اپنی زبان میں پڑھتے تھے۔ ملاحظہ ہو پہلوی کتابت کا فقرۂ ذیل :-

"پتکاری - زنا - مزدیسن - بگی - ارتخشتر - ملکان ملک - ایران - منوچیتری - من - نیرتان - بارہ - پاپکی - ملکا -" اس فقرہ میں سامی الفاظ 'ملکان ملک'، 'من'، اور 'ملکا' ملاحظہ طلب ہیں۔

علوم ریاضی کی ترقی کا ایک اور یونانی دور ہے جس کا مرکز مصر کا شہر اسکندریہ ہے۔ یہ دور سکندر کے بعد سے شروع ہوتا ہے اور رومیوں کے زمانہ تک قایم رہکر ختم ہو جاتا ہے۔ اس زمانہ میں بھی مشہور مہندس اور ریاضی داں مثل بطلیموس اور ارشمیدس نمودار ہوئے اور اُنھوں نے بڑی ترقیاں دکھائیں لیکن جہاں تک علم اعداد کا تعلق ہے وہ عراقی دور کی ترقی سے آگے نہ بڑھ سکے اور صفر اور ایک سے نو تک کے اعداد کی آسان تشکیل و استعمال سے قاصر رہے۔

بالجملہ روئداد مندرجۂ بالا کی چند باتیں ذہن میں رکھنے کے قابل ہیں :-

(۱) عراق و مصر کا وہ زمانہ جب وہ تصویری کتابت کے دور میں اعداد سے کام لینے لگے تھے یہاں تک کہ عراق میں صفر بھی ایجاد ہو چکا تھا۔ یہ بات کہنے سے رہ گئی کہ روتھس چائلڈ کے کارخانوں کی طرح قدیم عراق میں ساہوکاری کوٹھیاں قایم تھیں جو لین دین کا کام وسیع پیمانے پر کرتی تھیں۔

(۲) تاریخی زمانہ سے پہلے ہی وہ آلۂ شمار رائج ہو گیا تھا جس سے اعداد میں خلا کا احساس پیدا ہوتا ہے۔

(۳) فنیشیا کی سامی اقوام کا وہ زمانہ جب وہ تجارت کے سلسلہ میں دور دور پہونچکر حروف و اعداد کا علم پھیلا رہے تھے۔

(۴) آریہ فرقوں کے یونان - روم و ایران میں داخل ہونے کا زمانہ۔

(۵) فرقہ ہائے مذکور کا فن تحریر و اعداد سے داخلہ کے وقت تک ناواقف ہونا۔ اور سامی اقوام سے کتابت اور علم الاعداد حاصل کرنا۔

(نوٹ:۔ نمبر ۴ اور نمبر ۵ کی واقفیت اِس بحث سے متعلق ہے کہ آریہ فرقے وسط ایشیا سے اطراف عالم میں پہلے یا ہندوستان سے۔ کوئی بھی صورت ہو سوال یہ ہوگا کہ عیسیٰ سے ہزار دو ہزار برس پیشتر صرف ایک حصہ قوم مذکور کا پڑھا لکھا ہوتا اور باقی تمام حصے جاہل اور ان پڑھ، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

(۶) جس طرح باپ کی دولت اولاد کو ورثہ میں ملتی ہے۔ جس طرح ایک قوم کے زوال کے بعد دوسری قوم ترقی کرتی ہے۔ اُسی طرح علوم و فنون بھی دور بدور تھمتے اور بڑھتے جاتے ہیں۔ عراق و مصر کے بعد یونان۔ اُس کے بعد اسکندریہ۔ اُس کے بعد قرطبہ و بغداد۔ پھر یورپ اور اب امریکہ۔ (باقی) ح - ا

جنوری ۴۸ء کا "نگار" جوبلی نمبر

پاکستان نمبر بھی ہوگا

جس میں سندھ، پنجاب اور سرحد کی تمام گزشتہ اسلامی تاریخ کو پیش کر کے بتایا جائے گا کہ:۔

(۱) ہندوستان میں مسلم حکومت کی بنیاد کب اور کیونکر پڑی۔

(۲) سلاطین اسلامیہ ہند نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ کس غیر معمولی انصاف و رواداری سے کام لیا۔

(۳) علوم و فنون کی انھوں نے کتنی عظیم الشان خدمت انجام دی۔

(۴) تہذیب و تمدن کی ترقی میں انھوں نے کس قدر نمایاں حصہ لیا۔

ان کے علاوہ اور متعدد مقالات ہوں گے، جن میں عمومی طور پر اسلام کے عہد زریں اور مسلمانوں کی ذہنی و ثقافتی ترقیوں سے بحث کی جائے گی۔

تمام مقالات حضرت نیاز فتحپوری کے قلم سے ہونگے

یہ نمبر "نگار" کے تقریباً ۳۰۰ صفحات پر محیط ہوگا۔

قیمت فی کاپی تین روپیہ۔ لیکن خریداران نگار سے صرف سوا روپیہ۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

فارسی کے ساقی نامے

(بطرز ترجیع بند)

ساقی نامہ اس نظم کو کہتے ہیں جو مثنوی کی صورت میں ہو اور بحر متقارب میں لکھی گئی ہو، چنانچہ عبدالنبی فخر الزمانی مولف 'میخانہ'[1] نے پہلا ساقی نامہ شیخ نظامی گنجوی (متوفی ۵۹۹ ہجری) کے سکندر نامے سے مرتب کیا ہے، اس کے بعد مولف مذکور نے خسرو (۷۲۵ ہجری) جامی (۸۹۸ ہجری) اور ہاتفی (۹۲۷) کی مثنویوں سے اشعار منتخب کر کے ساقی نامے طیار کر لئے ہیں، بظاہر پہلا باقاعدہ ساقی نامہ خواجہ کرمانی (متوفی ۷۵۳) نے مثنوی 'ہمائے ہمایوں' میں شامل کیا، اسکے بعد ہی حافظ شیرازی (متوفی ۷۹۳) نے اپنا ساقی نامہ ایک مستقل نظم کی صورت میں مرتب کیا، میخانہ کی صراحت کے بموجب دسویں صدی ہجری کے نصف اول میں امیدی (متوفی ۹۲۵ یا ۹۳۰ ھ) پرتوی (۹۲۸ ھ)۔ شرف جہاں (۹۲۸ ھ) اور قاسمی (۹۸۲ ھ) کے ساقی نامے بہت مشہور ہوئے۔ دسویں صدی کے آخر سے ساقی نامے عام طور پر لکھے جانے لگے۔ مولف میخانہ نے لکھا ہے[2] کہ عہد جہانگیری کے ہنرمندوں کی طبیعت ساقی ناموں کی طرف بہت راغب ہے، اسی فطری میل کا نتیجہ ہے کہ اس زمانہ میں بڑے طویل ساقی نامے طیار ہونے لگے، چنانچہ ظہوری نے ساڑھے چار ہزار بیت کا ساقی نامہ مرتب کیا اور اس میں طرح طرح کے مضامین شامل کئے۔

ان ساقی ناموں کے علاوہ جو مثنوی کی شکل میں ہیں، متعدد ساقی نامے، ترجیع بند، ترکیب بند، رباعیات اور غزلیات کے طرز میں بھی پائے جاتے ہیں چنانچہ مؤلف میخانہ نے بہت سے ترجیع اور ترکیب بند اور چند غزلیں بھی درج کی ہیں، پہلا ترجیع بند فخر الدین عراقی (متوفی ۶۸۷) کا ہے جو خالص ساقی نامہ کے انداز میں لکھا گیا ہے، صاحب میخانہ لکھتا ہے:-

"ترجیع کہ آں مست مے خانۂ الٰہی بروش ساقی نامہ منظوم ساختہ، دریں اوراق پریشاں بر بیاض برد"

مولف میخانہ کی نظر میں جو ساقی نامے ترجیع بند کے طرز میں لکھے گئے تھے، کم اہم نہ تھے، وہ ان کو وہی درجہ دیتا ہے جو مثنویوں کو حاصل ہے، چنانچہ وحشی یزدی (متوفی ۹۹۱ ھ) کے ترجیع کا عنوان ہی ساقی نامہ ہے، مزید براں ہر نظم کے متعلق اس کے بیانات اس حقیقت کو پوری طرح روشن کرتے ہیں۔ مثلاً ایک[3] جگہ لکھتا ہے:-

---

[1] ابتدا سے گیارھویں صدی ہجری تک کے ساقی نامے اس میں جمع کئے گئے ہیں۔ [2] صفحہ ۵۰۔ [3] صفحہ ۴۷-۴۸۔ [4] صفحہ ۱۵۴

"ترجیع کہ بروش ساقی نامہ گفتہ دریں میخانہ بہ عوض مثنوی بر بیاض بردامید کہ در نظر اہل ہنر خارج نہ نماید"۔

دوسری جگہ[1] تحریر کرتا ہے:۔ "ساقی نامہ را بروش ترجیع گفتہ الحق خوب گفتہ است"۔

میخانہ کے ذیل کے بیان[2] کے مطابق یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حافظ شیرازی سے پہلے کسی نے مثنوی کا مخصوص نام ساقی نامہ نہیں قرار دیا تھا، "ایں لب تشنہ وادیِ مطالعہ اکثر دواوینِ قدما از ابتداء تا انتہا گشت (کذا)، از ہیچ دیوانے ساقی نامہ بہ سامانے بہ نظر در نیامد مگر از خواجہ حافظ"۔ چونکہ عراقی، حافظ سے تقریباً ۱۰۵ سال قبل ہی باقاعدہ ساقی نامہ ترجیع بند کی شکل میں پیش کر چکے تھے، اس لئے اولیت کا شرف ترجیع بند ہی کو حاصل ہے، عراقی کے ساقی نامہ میں ۱۵ بند ہیں جن میں ایک بند میخانہ میں حذف کر دیا گیا ہے، پہلے سات بندوں میں سات سات بیت ہیں، آٹھویں اور آخری بند میں نو نو، باقی میں دس دس، یہ ترجیع بند، ساقی نامہ کا مکمل نمونہ ہے۔ ہر بند میں ساقی سے خطاب کیا گیا ہے اور شراب کے خصوصیات بیان ہوئے ہیں، اس نظم کے چند مطلعے درج ذیل ہیں:۔

ساقی بدہ آب زندگانی — اکسیر حیات جاودانی،
وقت طرب ست ساقیا خیز — دردہ قدحِ نشاط انگیز،
ساقی چہ کنم بہ ساغر و جام — مستم کن ازاں مئے غم انجام
ساقی مئے مہر ریز در جام — بنما بہ شب آفتاب از بام،
ساقی بنما رُخ نکویت، — تا جام طرب کشم برویت
ساقی ز شراب خانۂ نوش — یک جام بیاور و ببر ہوش
ساقی بدہ آب آتش افروز — چو سوختہ ام تمام ترسوز

بیت ترجیع بھی بہت معنی خیز ہے:

در میکدہ می کشم سبوئے — باشد کہ بیابم از تو بوئے

اس ترجیع میں ساقی سے مراد خدا ہے، پوری نظم توحید کے مضامین سے پر ہے، ذیل میں آخری بند کے چند بیت درج ہیں:

ساقی قدحے کہ نیم مستیم، — مخمور صبوحی الستیم"
از جورِ تو خرقہا دریدم — وز دست تو توبہا شکستیم،
جز جان گرو دگر نہ داریم، — بپذیر کہ نیک تنگ دستیم
باہر چہ کہ داشتیم پیوند — از بہر تو زاں ہمہ گسستیم
بر در کہ لطف تو فتادیم، — در رحمت تو امید بستیم

---

[1] صفحہ ۳۲۴ — [2] صفحہ ۳۴۴

یہ جذبات سے بھرا ہوا ترجیع بند عراقی جیسے کاشف اسرار سبحانی کے طراوش خامہ کا نتیجہ ہے، اس کا ہر شعر پر اثر اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔

اس کے بعد میخانہ کے مولف نے وحشی یزدی (متوفی ۹۹۱ ہجری) کا ترجیع بند ساقی نامہ نقل کیا ہے جو عراقی کے ترجیع کے تین سو سال بعد مرتب ہوا ہے، اس سے یہ بات پایۂ یقین کو پہونچ جاتی ہے کہ ساقی نامے کے لئے شعرا نے اس صنف سخن کو زیادہ پسند نہیں کیا۔ وحشی نے یہ ترجیع عراقی سے الگ بحر میں لکھا، اس کی تجدید اس قدر مقبول ہوئی کہ دسویں اور گیارھویں صدی میں متعدد شعرا نے اپنے اپنے ساقی نامے اسی بحر میں مرتب کئے، بندوں کی ترتیب، ردیف و قوافی کی پابندی بھی کم و بیش وہی قایم رکھی گئی۔

وحشی کے ساقی نامہ میں کل ۱۶ بند ہیں جن میں بجز نویں، دسویں اور آخری بندوں کے جن میں صرف چھ چھ بیت ہیں ہر بند سات سات شعر پر مشتمل ہے، اس میں ساقی نامے کے جزئی لوازم موجود ہیں۔ شراب کی تعریف، اس کے لوازم، مطرب ساقی اور نغمہ کی مدح اور اس کا اثر میخانہ کی تعریف، اہل زمانہ کی شکایت (چونکہ اس سے قبل یہ عنصر مثنوی کے طرز کے ساقی ناموں میں داخل ہو چکا تھا، اس لئے اس کا شامل کرنا ضروری تھا) اور اس طرح کے بہت سے مضامین اس ترجیع بند میں شامل ہیں۔ ایک خاص خوبی اس ساقی نامہ کی یہ ہے کہ اس میں تسلسل کلام بہت بڑی حد تک قایم رکھا گیا ہے مثلاً تیسرے بند میں صرف شراب کی تعریف اور اس کی کیفیت بیان ہوئی ہے اور التزام یہ کیا ہے کہ ہر بیت کی ابتدا "آں مے" سے ہو، چوتھے بند میں نغمہ کا اثر مذکور ہوا ہے اور ہر بیت "آں نغمہ" سے شروع ہوتی ہے، گیارھویں بند میں مدرسہ اور خانقاہ کی ظاہر تعلیم پر تعریض کی ہے، بارھواں بند اپنے فقر کی تعریف اور امرا کی ذم پر مشتمل ہے، تیرھویں میں اہل زمانہ کی شکایت اور چودھویں میں شکایت کے بعد شراب کی خواہش کا بیان ہے، پندرھویں بند میں میخانہ کی مسلسل تعریف ہے، بظاہر وحشی کی مراد ساقی سے ساقیِ روز ازل ہے، گو اس کا صاف طور سے اظہار نہیں ہوتا مگر آخری بند کے چند اشعار اس امر پر کسی قدر روشنی ڈالتے ہیں:۔

وحشی مگر آں زمزمہ از جنگ بر آید — کز عہدۂ شکرِ مئے و ساقی بدر آید
آں ساقیِ باقی کہ پئے جرعہ کشِ او — خورشید قدح ساز و فلک شیشہ گر آید
آں دُردکہ در میکدۂ او بہ صفائت — لطفے ست کہ گر دانست چو در جام زر آید
خواہد ز سبوئے مئے او تاجِ سر خویش — آں کس کہ شدش بندۂ زریں کمر آید
در کوچۂ میخانۂ او گر فگنی راہ — بس خضر سبو کش کہ ترا در نظر آید
گر در بزنی صد قدمت پیش دوانند — آں وقت کہ آواز خروسِ سحر آید

بیت ترجیع یہ ہے:۔ ما گوشہ نشینانِ خراباتِ الستیم — تا بوئے مئے ہست دریں مے کدہ ہستیم

خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے یہ ترجیع بند بے حد بلند ہے، اشعارات بدیع و تشبیہات عجب اس کے خاص جوہر ہیں

ساقی نامے کی تاریخ میں نورالدین محمد ظہوری (متوفی ۱۰۱۵ھ) کا نام بے حد روشن ہے، ظہوری نے ساڑھے چار ہزار ابیات پر مشتمل ایک مثنوی ساقی نامہ کے عنوان سے لکھی اور اس کو برہان نظام شاہ ثانی (۹۹۹-۱۰۰۳ ہجری) کے نام سے معنون کی، مولف میخانہ نے اس میں سے صرف ۸۴۲ اشعار درج کئے ہیں، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولف مذکور نے صرف ابتدائی اشعار جن میں ساقی نامے کے تمام ضروری عنصر پائے جاتے ہیں، منتخب کرلئے تھے اور آخری بیت کا (جو بظاہر بے ربط ہے اور موجودہ ساقی ناموں میں موجود نہیں ہے) اضافہ کرکے ایک مکمل ساقی نامہ طیار کرلیا۔

ظہوری نے ابتداء میں کچھ اشعار منظوم کئے اور بعد میں جب اس نے برہان نظام شاہ کو اپنا ممدوح ٹھہرایا تو بقیہ اشعار لکھ کر اس کو ایک طویل ساقی نامہ کی شکل میں پیش کیا، ذیل کے چند اشعار جو خاتمہ کتاب میں درج ہیں اس حقیقت کا انکشاف کرتے ہیں:-

به چندے ازیں پیش کاندر قلم — شد آخر ز ساقی و ساغر رقم
نگاہے ز حاسد گرفتم به دام — سراپائے ایں نسخہ دیدم تمام
زدم قرعہ کایں گوہر شاہ وار — به دست ثنا برکہ سازم نثار
بکوس سخن شد دواں آشنا، — به نام کسے بر نیامد صدا،
زدہ سال افزوں بریں سرگزشت — گزشت و دل از نیت خود بگشت
علم شد به نورے دگر آفتاب — ز رگہائے جاں باز شد پیچ و تاب
ز بس نغمۂ بلبل تہنیت — جہاں شد پر از غلغل تہنیت
دراں ہائے و ہو مستمع گشت ہوش — ہمہ نام برہاں شہ آمد به گوش
کشیدم ورقہائے پیشینہ پیش — شدم طوطی و چیدم آئینہ پیش
دم از سینۂ صبح پر تو زدم، — بر آں کہنہ زر سکۂ نو زدم
چو آں کہنہ با تازہ پیوند شد — زبانہا به تحسیں بر و مند شد

اس ساقی نامہ کے علاوہ ظہوری نے ایک ترجیع بند ساقی نامہ شاہ نواز خاں شیرازی وزیر ابراہیم عادل شاہ ثانی (۹۸۸-۱۰۳۷ ہجری) کی مدح میں لکھا ہے اور ضمناً بادشاہ مذکور کی بھی تعریف آگئی ہے، مگر بدقسمتی سے یہ ترجیع صاحب تذکرۂ میخانہ کو دستیاب نہ ہوسکا تھا۔ یہ وحشی کے ترجیع کی ہو بہو نقل ہے، اگرچہ ظہوری اور وحشی معاصر ہیں اور دونوں ایک عرصہ تک میر میران یزدی سے متعلق رہے ہیں لیکن وحشی کا ترجیع ظہوری سے مقدم ہے کیونکہ

آخرالذکر وحشی کی وفات کے تقریباً ۱۴ سال بعد دربار بیجاپور سے متعلق ہوا ہے اور اس ترجیع کو یقیناً اس کے بعد کا سمجھنا چاہئے۔

ظہوری کا ترجیع بند صرف اس کے کلیات (مملوکہ امیر الدولہ لائبریری لکھنؤ) میں محفوظ ہے، رام پور کے سرکاری کتاب خانہ اور بانکی پور کے کتاب خانہ میں ظہوری کے کلیات کے جو نسخے موجود ہیں ان میں یہ ترجیع نہیں پایا جاتا۔ اس ترجیع کی ملکیت مجہول یا مشتبہ بھی قرار نہیں دیجا سکتی کیونکہ اس میں ظہوری کا تخلص صراحتاً موجود ہے، مزید براں ملک قمی نے بھی ایک ترجیع بند ساقی نامہ کے عنوان سے مذکورہ بالا دونوں ممدوحین کی تعریف میں سپرد قلم کیا ہے اور چونکہ ظہوری اور ملک قمی نے بیشتر نظمیں ایک ہی بحر، ردیف و قافیہ اور ایک ہی عنوان سے لکھی ہیں اس لئے ظہوری کے ترجیع کی نسبت اور بھی پختہ اور قابل یقین ہو جاتی ہے، بخلاف ملک قمی کے ظہوری کے ترجیع کا کوئی خاص عنوان نہیں ہے، لیکن چونکہ کلیات مذکور میں کسی نظم کا کوئی عنوان نہیں ملتا اس لئے اس خاص نظم کا عنوان نہ ہونا حیرت انگیز نہیں۔

اس ترجیع میں ۱۷ بند ہیں جن میں ۱۴ بندوں میں نو نو بیت ہیں، تیسرے آٹھویں اور سولھویں میں آٹھ آٹھ بیت اور تیرھویں میں صرف سات بیت ہیں ابتدائی ۱۱ بندوں اور پندرھویں بند کے ردیف و قوافی وہی ہیں جو وحشی کی ہیں۔ ذیل میں دونوں ترجیع کے مطلع درج ہیں جن سے یہ بات صاف طور سے ظاہر ہو جاتی ہے کہ ظہوری نے وحشی سے کسقدر[1] استفادہ کیا ہے

ظہوری	وحشی
(کذا) در مجلس ساقی نغمانہ حسود است	ساقی بدہ آں بادہ کہ اکسیر وجود است
(کذا) مطرب کرمی چنگ تو کو چنگ بران زن	مطرب بنوائی تو رہ بے خبراں زن
جامے کہ ز دلہا شجر طور بر آورد	ساقی بدہ آں مے کہ ز جاں شور برآرد
(کذا) زاہد بکش آں مے کہ من ست رنگ نگیرد	گو مطرب خوش نغمہ کہ آتش اثر آید
ساقی بہ کہ گویم کہ از عمر بجانیم	دیرے ست کہ ما معتکف دیر مغانیم
مستان تو ساقی بکس دیگر نشناسند	رندان خرابات سر و زر نہ شناسند
زردی نہ دمیدی ز جبیں برگ زراں را	تا راہ نمودند بما دیر مغاں را
بر برگ گلے بستر من لبتہ[2] خارے ست	ترسا بچہ گزمے و جامش خبرم نیست
خود را بہ رگ دیدہ ہمہ بر تار ببندیم	گر عشق کند امر کہ زنار ببندیم
در گلشن مستی گل صد خم کدہ چیدیم	رفتم بہ درِ مدرسہ و گوش کشیدیم
ساقی یدبیضا بنمائیست کلیمے	الحق اللہ کہ نہ دارم ز رو سیمے
بزمے کہ بہ ساغر نہ رود بادۂ دیدار	بر دیدہ حرام ست بہ حکم شہ دیں را

[1] افسوس ہے کہ ظہوری سے ترجیع کے بیشتر مطلع پڑھے نہ جا سکے — [2] اس کا مطلع محذوف ہے۔

ظہوری کی بیت ترجیع بھی وحشی کی بیت سے بہت قریب تر ہے،

کردیم اگر توبہ درستانۂ شکستیم، زاہد! نہ کنی عربدہ ہشیار کہ مستیم

ظہوری کے یہاں ساقی سے کوئی خاص ذات مراد نہیں۔ شاہ نواز خاں کی تعریف کے لئے ۵ بند مخصوص ہیں۔ پندرھویں بند میں بادشاہ کا بھی ذکر ہے، تیرھویں بند میں گریز کی شان پائی جاتی ہے، شاعر ساقی سے شراب کی خواہش کرتا ہے تاکہ شاہ نواز خاں کی تعریف سے عہدہ برآ ہو سکے، (ملک قمی (متوفی ۱۰۲۴ھ) کا بھی ترجیع بند میخانہ میں نقل نہیں ہے، اس کے بجائے اس کی ایک مثنوی جو ساقی نامہ کے طرز میں ہے مندرج ہے، ظہوری کی طرح ملک قمی نے بھی یہ ترجیع وحشی کی اتباع میں لکھا تھا۔ میخانہ کی صراحت[1] کے بموجب ملک، وحشی سے ۴ سال عمر میں بڑا تھا۔ لیکن یہ متحقق ہے کہ ملک کا ترجیع وحشی سے بہت بعد کا ہے کیونکہ وہ وحشی کی وفات کے تقریباً ۱۴ سال بعد بیجاپور جاکر ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دامن دولت سے وابستہ ہوا ہے۔ اور چونکہ اس ترجیع میں سلطان مذکور کی تعریف موجود ہے اس سے یہ بات مسلم ہو جاتی ہے کہ یہ بیجاپور کے قیام کے دوران میں لکھا گیا۔

ملک کا ترجیع ۱۷ بندوں پر مشتمل ہے، بندوں کے ابیات ۶ سے ۱۰ تک ہیں۔ ان میں سے کم و بیش ۱۱ بند وحشی ہی کی ردیف و قوافی میں ہیں۔ ذیل میں چند مطلع جو وحشی سے مستفاد ہیں مندرج ہیں :-

اے حرف حریف تو بہر طور کلیمے، فرعون زباں آور و موسیٰ ست ندیمے
کو عشق کہ خورشید در و بام وجود است عکس دو جہاں آئینہ بود و نبود است
چوں بوئے مے از خاکِ خرابات بر آید مے گل شود و از رخ ساقی بدر آید
از کف نہ گزارند سبک رطل گراں را شاید بگذاریم غم ما گزراں را
وقت ست کہ صوت دوسہ برکار ببندم نقشے کہ ببندد در گفتار ببندم
ساقی بہ قدح زمزمۂ بے خبراں زن مطرب نفسے بر نفس صیحہ گراں زن
شد داغ جبیں چشم دو رو سرمہ کشیدیم دیدیم ہماں راز کہ در پردہ شنیدیم
جائے نگرانیم کہ از دیدہ ورانیم، نذر نظرے خواہ کہ صاحب نظرانیم
زاہد کہ گراں بود بر و جامہ و دستار گرداند بہ گرد مے و نخشید بہ خمار
بامے لب ساقی لب ساغر نہ شناسیم مستیم چناں کاب رز از زر نہ شناسیم

ذیل میں وحشی اور ملک کے دو مشترک اور مشابہ مطلع مندرج ہیں۔

(ملک)	(وحشی)
آئینہ ز دود دل ما در تب و تاب ست — بے روے تو سرچشمۂ خورشید سراب ست	گر شکوہ دہد بہ زباں بزم شراب ست — باید کہ بشویند ز دل عالم آب ست

[1] میخانہ میں وحشی کا سال ولادت ۹۳۸ ہجری اور ملک کا ۹۴۲ ہجری

ملک کی بیت ترجیع بہ نسبت ظہوری کی، وحشی کی بیت سے زیادہ مشابہ ہے:

ما مست صفیران گلستان الستیم باعہد ازل چوں گل و مل دست بہ دستیم

ظہوری اور ملک کے ایک بند مشابہ ہیں، ان کے مطلعے درج ذیل ہیں:-

(ملک) ظہوری

خورشید دکن تخت اگر تاج برازاست اورسایۂ حق سایۂ او شاہ نواز است | در ہائے نوازش کہ بہ روے ہمہ باز است از مکرمت خاں جہاں شاہ نواز است

ظہوری اور ملک کے ترجیعات بہت سی باتوں میں یکساں ہیں، دونوں ایک ہی وقت میں لکھے گئے ہیں، دونوں میں ابراہیم عادل اور اس کے وکیل السلطنت شاہ نواز خاں کی مدح ہے، دونوں میں سترہ سترہ بند ہیں، دونوں کے ۱۱ بند ایک ہی زمین میں ہیں۔ دونوں نے وحشی سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن چند باتوں میں مختلف ہیں۔ ملک کے ترجیع بند کا عنوان رام پور کے نسخہ میں یہ ہے:- "ترجیع بند ساقی نامہ در توحید" اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس میں توحید کے مضامین ہیں، برخلاف اس کے ظہوری کا ترجیع محض عاشقانہ ہے۔ ملک کی نظم میں بادشاہ اور وزیر کی مدح ضمنی ہے لیکن ظہوری کا ترجیع انھیں کی تعریف کے لئے مخصوص ہے۔ ظہوری نے بندوں کی ترتیب میں بھی وحشی کی پیروی کی لیکن ملک نے اس لحاظ سے وحشی کی مطلق تقلید نہیں کی۔

اسی دور کا ایک شاعر ابو تراب بیگ فرقتی ہے۔ سلطان محمد خدابندہ اور شاہ عباس صفوی کے عہد حکومت میں اس کی شاعری کی شہرت ہوئی۔ مراۃ العالم[1] کے مولف کے قول کے مطابق اس نے کسی بادشاہ کی ملازمت اختیار نہیں کی اور ۱۰۲۷ ہجری میں صفاہان میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مگر نشتر عشق[2] نے اس کا سال وفات ۱۰۲۶ ہجری ٹھہرایا ہے، فرقتی نے ایک ترجیع بند ساقی نامہ وحشی کے ترجیع کی زمین میں لکھا ہے، لیکن اس پر ظہوری کے ترجیع کا بھی کافی اثر معلوم ہوتا ہے بظاہر کوئی ایسا قوی قرینہ نہیں پایا جاتا جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ ظہوری اور فرقتی میں کس کا ترجیع مقدم ہے۔ البتہ تتمۂ حواشی میخانہ[3] سے ایسا پتہ چلتا ہے کہ فرقتی، ملا وحشی کا مصاحب تھا۔ اس سے یہ بات زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس نے وحشی کی تقلید میں یہ ساقی نامہ لکھا ہوگا۔ اور اسی اعتبار سے اس کا وحشی کے ایام حیات میں لکھا جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ اس صورت میں ساقی نامہ کو ظہوری کے ترجیع سے بہت قبل کا ماننا پڑے گا۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ فرقتی کا ہندوستان آنا ثابت نہیں ہے اور چونکہ ظہوری کا ساقی نامہ ہندوستان ہی میں لکھا گیا اس لئے فرقتی کو وحشی کی اتباع کرنا زیادہ آسان تھی۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ جب وحشی کو اس طرح کے ترجیع بند لکھنے کا شرف اولیت حاصل تھا تو فرقتی کے لئے وحشی کے ترجیع کی نقل کرنا زیادہ مناسب تھا۔ پھر بھی چونکہ ظہوری اور فرقتی کے پانچ بند ایک زمین میں ہیں یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا ہو۔

اس ترجیع میں کل ۱۵ بند ہیں، ہر بند میں سات سات بیت ہیں۔ وحشی کے بھی بیشتر بند سات ہی ابیات پر مشتمل ہیں

---

[1] قلمی صدا ایوب بانکی پور ۔ [2] قلمی بانکی پور ۔ [3] قلمی بانکی پور

مگر صرف نو بند ایسے ہیں جن کی ردیف و قوافی وحشی کے مشابہ ہیں جب کہ ظہوری کے پانچ بند فرقتی سے ملتے جلتے ہیں۔ وحشی کے چند مطلعے "ساقی بدہ آں بادہ کہ" سے شروع ہوتے ہیں۔ اس کی اتباع میں فرقتی نے چند بندوں کی ابتدا انھیں الفاظ سے کی ہے، ظہوری اور فرقتی کے مشترک مطلعے درج ذیل ہیں:

فرقتی	ظہوری
ساقی بدہ آں بادہ کہ ماہ شب تار است	گل بوشدہ مے چوں نشود فصل بہار است
ساقی بدہ آں شمع سرا پردۂ جاں را	ساقی ز شرابے کہ سخن تازہ بآں است
ساقی بدہ آں بادہ کہ خون دل کاں است	می بود اگر رنگے ازیں بادخزاں را
مادل شدگاں را چمن عیش مقام است	در میکدہ گشتیم مقیم ایں چہ مقام است
بیہودہ چہ دل در غم اغیار بندیم	خود را بہ رگ دپے ہمہ بر تار بندیم
آں روضہ کہ سرو و گلش از شیشہ و جام است	مستیش بہ رنگینی رخسار نگار است
آں شعلہ کہ از عکس کند شعلہ دخاں را	جامے بہ ظہوری کہ تنا گستر خان است
آں مے کہ چو جاں در بدن شیشہ نہاں است	گر دی نہ دمیدی ز جبیں برگ زراں را
آں بہ کہ لب از شکوۂ بسیار ببندیم	حیف است نگہ چشم ز اغیار ببندیم

فرقتی کی بیت ترجیع بھی وحشی سے زیادہ مشابہ ہے:-

ما خشک لباں تشنۂ دیدار شرابیم — چوں کاسۂ ما گشت تہی خانہ خرابیم

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجیع بند کسی بادشاہ کی فرمائش سے نہیں لکھا گیا ہے، ساقی سے ساقی کوثر مراد ہے آخری بند میں اپنی غفلت، آشفتہ حالی اور سیاہ بختی کا ذکر کیا ہے، چند بیت درج ہیں:-

من کیستم؟ آشفتہ دلی، خانہ خرابی — در بحر غم افتادہ چو ماہی بہ سرابی
در دہر بود خانۂ ویرانۂ چشمم — چوں در دم طوفان بہ سر بحر حبابی
بر چرخ بود کوکب سیارہ نجستم — چوں نقطۂ بیہودۂ کاتب بہ کتابی
پیوستہ بود بر سر سیلاب سر شکم — ایں چرخ نگوں ہم چو پلے بر سر آبی
یک لحظہ نہ کردم ز گرفتاری غفلت — کارے کہ بہ محشر بودم چشم ثوابی
آنم کہ بہ صحرائے قیامت چو در آیم — افتند بہ دنبالِ سرم خیل خرابی
بایں ہمہ چوں شعلہ نیابم ضرر از نار — گر ساقی کوثر دہدم جام شرابی

مولف 'مے خانہ' نے 'ترجیع بند' مذکور کو بے حد پسند کیا ہے، مراۃ العالم کے مولف نے اس ترجیع سے چند بیت منتخب کئے ہیں۔

اسی عہد کے ایک اور مشہور شاعر غفور گیلانی (متوفی ۱۰۲۸ھ) نے ۱۱ بند کا ایک ترجیع وحشی کے طرز میں لکھا۔ اگرچہ قطعی طور سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ترجیع خاص کر کس کی نقل ہے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اس کے پیش نظر ظہوری اور ملک کے بھی ترجیعات رہے ہوں جب کہ یہ بات مسلم ہے کہ ۱۰۱۲ ہجری کے قریب وہ ہندوستان آیا تھا۔

لہ حواشی میخانہ صفحہ ۸۴ — لہ میخانہ (حاشیہ) صفحہ ۳۳۳

اس کا ہر بند سوائے بند دہم کے جس میں ۸ بیت ہیں، ۱۹ اشعار پر مشتمل ہے، ان میں صرف ۴ بند وحشی، ظہوری اور فرقتی کی زمین میں ہیں۔ پہلا بند فرقتی کے پہلے بند کے مشابہ ہے، چند مشترک مطلعے درج ہیں:۔

ساقی بدہ آں بادہ کہ خورشید شرار است — چوں آتش گل ریز بہ دامان بہار است
رفتیم بہ بکبار رہ دیر و حرم را — یکوست گرفتیم صمد را و صنم را
مطرب رہ بلبل زدہ، ساقی رہ گلزار — گل می شگفد بلبلہ را از سر منقار
زاہد اگرت میل سبکساری جان است — بر دوش سبو گیر کہ سجادہ گراں است

بیت ترجیع کا قافیہ تمام بیتوں سے مختلف ہے:

مادجلہ کشی یاد گرفتیم ز استاد — مارا خط بغداد بہ از خطۂ بغداد

اس میں تصوف کا عنصر زیادہ ہے، ساقی سے کوئی خاص ممدوح مراد نہیں ہے اور نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کس کے حکم سے اور کس کی تعریف میں لکھا گیا۔

اس عہد کے ایک شاعر کامل جہرمی نے وحشی کے طرز میں ایک ترجیع بند ساقی نامہ لکھا، اس کا ہر بند وحشی کے ہر بند کے مشابہ ہے، ترتیب بھی بعینہ وہی قایم رکھی گئی ہے۔ کل ۱۶ بند ہیں۔ بجز پانچویں بند کے ہر بند میں سات سات بیت ہیں۔ تعداد ابیات کے اعتبار سے بھی یہ ترجیع بالکل وحشی کے ترجیع کا جواب ہے۔ ہر بند کے مطلعے درج ذیل ہیں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ کامل نے وحشی سے کس قدر استفادہ کیا ہے، اگرچہ پروفیسر شفیع[1] نے ساتویں اور نویں بند سے جو فرقتی کے دوسرے اور تیرھویں بند کے متوازی ہیں یہ قیاس کیا ہے کہ فرقتی کا ساقی نامہ کامل کے پیش نظر تھا۔

ساقی بدہ آں مے کہ زیانش ہمہ سود است — چوں دست و دل پیر مغاں مایۂ جود است
اے مطرب مستاں رہ خونیں جگراں زن — وز زمزمہ ناخن بہ دل بے خبراں زن
خمار عصیرے کہ ز انگور بر آرد ،، — آبے ست کہ ریزد بہ خم و نور بر آرد
اے مطرب موزوں چو لبت نغمہ سراید — از رشک نوا ساز فلک نوحہ گر آید
نے دشمن دو زخ نہ ہوا خواہ جنانیم — دیرے ست کہ مستغنی ازیں سود و زیانیم
مستان سخن واعظ و منبر نہ شناسند — غیر از سر خم منبر دیگر نہ شناسند
خواہم کہ ز خود دور کنم نام و نشاں را — تا خدمت شائستہ کنم پیر مغاں را
عمرے ست کہ از نیک و بد خود خبرم نیست — از نغمہ گزیرے و ز ساغر گزرم نیست
چوں پیر مغاں گفت کہ زنار ببندیم — از طرۂ ہر غنچہ یک تار ببندیم،
از خرقۂ پشمینہ زہاد زیاں کار، — کردیم بہ یک حیلہ بروں صد بت پندار

---

[1] یغما: (حاشیہ) صفحہ ۳۴۳

در مدرسہ و صومعہ بسیار دویدیم — از علم و عمل چاشنی عشق ندیدیم
از مال جہاں گرچہ نہ دارم زر و سیمے — دارم ز دل و دیدۂ خود ناز و نعیمے،

وحشی کے متوازی مطلع ظہوری کے ترجیع کے سلسلہ میں درج ہو چکے ہیں بقیہ چار مطلع بالمقابل درج ہیں۔

کامل	وحشی
از حرص و امل ہست جہاں زاہل زمانہ — پر ولولہ و شور چو حمام زنانہ	دارم بہ زباں شکوۂ از اہل زمانہ — کو مطرب سازے کہ بگویم ترانہ
مے نوش کہ بنیاد جہاں بر سر آب است — چیزے کہ ز خویشت برہاند مے ناب است	گر شکوہ آمد بہ زباں بزم شراب است — باید کہ بشوئید ز دل، عالم آب است
رفتہ بہ خرابات و تماشائے خم او — کز غم بگریزم بہ تہ پائے خم او	میخانہ کہ پروردہ ام از لائے خم او — بادا سر من خاک کف پائے خم او
کامل سرت از بادہ مبادا کہ بر آید — ہشدار کہ چوں بادہ رود در سر آید	وحشی مگر آں زمزمہ از چنگ برآید — کز عہدۂ شکر مئے و ساقی بدر آید

بیت ترجیع بھی وحشی سے بہت قریب تر ہے:

ما صاف دلاں درد کش بزم الستیم — با نغمہ و مے لب بہ لب و دست بہ دستیم

وحشی کی طرح کامل نے ساقی سے ساقی کوثر مراد لیا ہے، آخری بند میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے:

ایں بادۂ عشق ست نہ خمرست کہ مستیش، — گر عربدہ جو گردد و گر فتنہ گر آید
بر اہل کرامات شود کشف مقامات — از شیشہ چو بر جوشد و در جام در آید
عارف رہ صد سال بہ یک جرعہ کند طے — با دوست بہ پیوندد و از خویش بر آید
از ساقی باقی طلب آں مے کہ ز عارف — ہر راز کہ پوشیدہ بود در نظر آید
در میکدہ از آلودگی نفس شدم پاک — از بادہ بشوئیدم اگر عمر سر آید

وحشی کی تقلید میں اس ترجیع میں تسلسل کلام کی چاشنی موجود ہے۔ معنوی حیثیت سے بھی یہ ترجیع وحشی کی ہو بہو نقل ہے، ساقی کی مدح، شراب کی تعریف، اسکے اثرات و کیفیات، میخانہ اور مطرب کی تعریف، بے ثباتی دنیا کا نقشہ، شکایت روزگار، واعظ پر طنز زاہد پر پھبتی، تعلیم ظاہری کی تعریف و تنقیص وغیرہ اس کے مضامین ہیں۔ تفصیل بالا سے وحشی کے ترجیع بند کی غیر معمولی مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، خود اس کے معاصرین اس کی استادی کے قائل تھے۔ وحشی سے مشہور تر شعرا نے اسکی تقلید کی یہ بھی قرین قیاس ہے کہ اور بھی شعرا ہوں گے جنھوں نے وحشی کے ترجیع کی پیروی کی ہوگی لیکن اب تک کسی صاحب کی نظر وہاں نہیں پہنچ سکی ہے۔ معاصرین کی تقلید سے یہ صریحی نتیجہ نکلتا ہے کہ متاخرین کے دور آخر میں بہتوں نے اس ترجیع کے جواب میں نظمیں لکھی ہوں گی، لیکن چونکہ اس دور کے ساقی نامے یکجا جمع نہیں ہوئے (اور اگر ہوئے بھی ہوں تو ناپید و نایاب ہیں) اس لئے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔ اگر کوئی صاحب ذوق شعرائے متاخرین کے کلیات سے ساقی نامے جمع کریں تو یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی۔

ڈاکٹر نذیر احمد ام۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی

باب المراسلہ والمناظرہ

فرائڈ کا جنسیاتی نظریہ

(از جناب محشر رام۔ اے۔ ملتان)

غالباً آپ نے مارچ کے نگار میں 'باب الاستفسار' کے تحت اُردو ادب میں موجودہ فحش نگاری کے متعلق کچھ لکھا تھا اور توقع کی تھی کہ اس مسئلہ پر کوئی ترقی پسند ادیب روشنی ڈال سکے گا، مگر میری نظر سے ایسا کوئی جواب ابتک نہیں گزرا، اس لئے اس مضمون کے آخر میں تھوڑا سا اشارہ اس طرف بھی کر دیا ہے شاید اس سے کسی ترقی پسند کو کچھ لکھنے کا خیال پیدا ہو۔ بہرکیف فرائڈ کے نظریہ کے پیش نظر ان کی فحش نگاری ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یا تو انھوں نے فرائڈ کے نظریہ کو نہیں سمجھا یا پھر اس کا کوئی اور سبب ہے۔

فرائڈ کا استدلال اکثر 'جنس' کے گرد گھومتا ہے گو اس سے پہلے اور غالباً یورپ میں سب سے پہلے ڈھیلر نے اپنا جنسی نظریہ دنیا کے سامنے رکھا تھا جس کا ردِ عمل اسٹانلی تھا مگر فرائڈ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ جنس کو شعور اور دل و دماغ کے مرکز میں کھینچ لایا یہ ایک ایسا گہرا نفسیاتی اقدام تھا کہ دشمن تک اس کی افادیت سے انکار نہ کر سکے۔ مگر افسوس کہ اس نے اس مسئلہ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیدی جس سے اسکی تحریریں فلسفہ و نفسیات سے زیادہ شہوانی جذبات کا مطالعہ نظر آتی ہیں۔

سب سے پہلے اس واقعہ کا ذکر جس نے اس کی زندگی کا رُخ بدل دیا، دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جنگِ عظیم سے چند سال پیشتر کا واقعہ ہے کہ فرائڈ، ڈاکٹر شرکوٹ کے یہاں، ہپناٹزم سیکھنے گیا۔ ایک دن ڈاکٹر موصوف نے ہسٹیریا کی ایک مریضہ کو دیکھ کر کہا "ہسٹیریا کی علت غالباً جنسی ہوا کرتی ہے" یہ فقرہ سن کر اس کا شاگرد (فرائڈ) چونک پڑا۔ پوچھا "کیا ہمیشہ" اس نے جواب دیا "ہاں ہمیشہ" بس یہاں سے فرائڈ کو اعصابی امراض میں جنسی علت ڈھونڈھنے کا خیال پیدا ہوا۔ پھر اس نے پیہم تجربات اور خوابوں کی تعبیرات سے نظریے قایم کئے اور جنسی مضمرات کو روشنی میں لایا جس کی اولیت کا سہرا اسی کے سر ہے۔

فرائڈ نے انسانی زندگی کو مختلف مرحلوں میں تقسیم کیا ہے، سب سے پہلا مرحلہ بچے کا پستان چوسنا ہے، فرائڈ کے نزدیک بچے کا یہ عمل جنسی نوعیت رکھتا ہے جس کو وہ خواہشِ استلذاذ (Libido) کہتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ عمل اکتسابِ لذت سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یوں بھی بچے انگوٹھا چوستا رہتا ہے۔ دوسرا مرحلہ 'تعشق بالنفس' (Auto erotic Phase) کا ہے اس عہد میں بچہ حوائجِ ضروریہ کے رفع کرنے میں لذت محسوس کرتا ہے اور بڑے ہو کر اس کی یہ دلچسپی جنسی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ تیسرا مرحلہ Ambero bism کا ہے اس عہد میں بچے کے اندر بعض اعضا سے اکتسابِ لذت کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اس

احساسِ لذت کشی کو فرائڈ نے "خود پسندی" سے تعبیر کیا ہے چوتھا مرحلہ انفعالی عشق، Objective Love کا ہے اس عہد میں بچہ دوسروں سے اکتسابِ لذت کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں فرائڈ نے ایک حیرت انگیز خیال ظاہر کیا ہے کہ اس عہد میں بچے کی خواہشِ استلذاذ والدین کا رخ کرتی ہے اور بچہ ماں سے عشق کرنے لگ جاتا ہے اور اس سلسلہ میں باپ کو رقیب پاکر حسد اور رشک کے جذبات دل کے اندر پیدا کرلیتا ہے، مگر وہ اس کے اظہار سے خود کو روکتا ہے جس سے پہلی ذہنی گرہ oedipus Complex پیدا ہوجاتی ہے اور اس کے بعد ان ذہنی گرہوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ یہ "ذہنی گرہیں" کیا چیز ہیں؟ ۔۔۔۔۔ مثال کے طور پر بچے کو لیجئے اس کے دل میں طرح طرح کی خواہشات جنم لیتی ہیں، جن میں سے بعض کمزور ہوتی ہیں اور بعض طاقتور۔ پہلے پہل جو خواہش اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے وہ اکثر کمزور ہوتی ہے مگر آہستہ آہستہ تیز تر ہوتی چلی جاتی ہے اور دماغ و دل پر مستولی ہوجاتی ہے یہاں تک کہ دفعتہً اس خواہش کی تکمیل میں ناکامی بچے کے دماغ کے لئے ایک حادثہ ثابت ہوتا ہے اور اس سے دو صورتیں ظہور میں آتی ہیں یا تو اس کا ذہن حادثے کی تاب نہ لاکر توازن کھو بیٹھتا ہے یا پھر اس کے دل پر اس ذہنی حادثہ کی ایک 'چوٹ' باقی رہ جاتی ہے اور اس چوٹ کا نام 'ذہنی اُلجھن' Traume ہے مگر وہ خواہش بذاتِ خود مٹ نہیں جاتی بلکہ لاشعور میں چلی جاتی ہے۔

یہاں سے لاشعور کی اہمیت پیدا ہوجاتی ہے مگر سوال یہ ہے کہ لاشعور کیا چیز ہے ۔۔۔۔۔ مثال کے طور پر ایک طالبعلم کو لیجئے پروفیسر لکچر دے رہا ہے اور طالبعلم کی نظریں کبھی اس کے چہرے پر۔ کبھی تختۂ سیاہ پر۔ کبھی اپنے ماحول کی اشیا پر پڑتی رہتی ہیں، مگر کیا طالبعلم کا ذہن فقط انھیں چیزوں کا علم رکھتا ہے؟ ۔۔۔۔۔ بلکہ وہ اپنے رشتہ داروں کا علم رکھتا ہے اپنے تعلقات کی نوعیت کا اُسے علم ہے اسے اپنی کتابوں کے اندر خیالات اور آرا کا علم ہے اور اس طرح کی بہت سے اشیا سے اسکا ذہن واقف ہے مگر وہ خیالات اب کہاں ہیں؟ ظاہر ہے کہ دماغ کے کسی کونے میں مرکوز ہیں اور یاد کرنے پر فوراً سامنے آجاتے ہیں ان دو حالتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلی حالت کا نام 'شعور' Conscious Mind ہے اور دوسری حالت کا نام 'تحت الشعور' ہے جس پر فرائڈ نے بہت زور دیا ہے۔ اس کے نزدیک لاشعور ہماری زندگی میں نہایت اہم پارٹ ادا کرتا ہے اس کی اہمیت کی ایک مثال ملاحظہ ہو ۔۔۔۔۔ ایک دفعہ فرائڈ نے ہپناٹزم سے 'معمول' کو مدہوش کیا جس سے اسکا لاشعور اُبھر آیا، عامل نے اس کو حکم دیا کہ فلاں تاریخ فلاں وقت تمھیں اپنے بوٹ سر پر رکھ کر چلنا ہوگا۔ اس کے بعد حالتِ مدہوشی توڑ دی گئی اُسے بالکل کچھ یاد نہ تھا کہ عامل اور اس کے درمیان کیا گفتگو ہوئی مگر مقررہ تاریخ اور مقررہ وقت پر دو لاشعوری طور پر بوٹ سر پر اُٹھائے پھرتا تھا۔ اس طرح اور بہت سے حیرت انگیز واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ انسان کا جمالیاتی ذوق بھی عموماً لاشعور کا مرہونِ احسان ہوتا ہے، چنانچہ فرائڈ کے نزدیک ہماری جمالیاتی مسرت جنسی جذبہ کی ایک ارفع اور "منطقی شعور" کی بلند صورت ہے۔ مثلاً بعض بچے مٹی اور پتھروں سے دلچسپی رکھتے ہیں، بڑے ہوکر ان کی یہ دلچسپی مصوری اور سنگتراشی کی اعلیٰ صورت اختیار کرلیتی ہے اسی طرح وہ اشخاص جنھیں علمِ جنسیات سے شغف ہوتا ہے اکثر ڈاکٹری کا پیشہ اختیار کرتے ہیں

عشق بالنفس والے عموماً شاعر بنتے ہیں۔ کیونکہ خواہشات دبانے سے مٹ نہیں جاتیں بلکہ لاشعور میں چلی جاتی ہیں اور بعد میں وہ باہر نکلنے کی کوئی نہ کوئی صورت نکال لیتی ہیں، مگر شعور انھیں اُبھرنے نہیں دیتا۔ اول الذکر حیوانی خواہشات کو فرائڈ نے "جبلی حرکتِ ارادی" کا نام دیا ہے اور شعور کے چوکیدار کا نام super-ego یعنی "منطقی شعور" رکھا ہے۔ ان دو میں دائمی جنگ جاری رہتی ہے "جبلی حرکتِ ارادی" دبی خواہشات کو شعور میں دھکیل دیتی ہے مگر شعور انھیں پھر دبا دیتا ہے۔ اس جنگ کا ایک منظری پہلو خواب ہے۔ نیند میں شعور کا محافظ ہو جاتا ہے، جس سے جبلی حرکتِ ارادی دبی خواہشات کا لشکر لیکر میدانِ شعور میں آدھمکتی ہے مگر شعور کے جاگنے سے پھر بھاگ جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم سوتے سوتے چونک اُٹھتے ہیں یا عموماً خواب کے بعد فوراً جاگ پڑتے ہیں۔ اسی طرح لاشعور سے دبی خواہشات اور جذبات بھیس بدل بدل کر آتے رہتے ہیں اور نکاس کا راستہ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ لاشعور اپنے اشارات سے شعور کی توجہ ان دبی خواہشات کی طرف مبذول کراتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواب کی تعبیر میں اشارات واقعات پر دلالت کرتے ہیں اور یہی جبلی حرکتِ ارادی انسانی اعمال و افعال کا منبع ہے جس کو حد سے زیادہ دبانا نظامِ زندگی کو درہم برہم کرنے کے مترادف ہے۔ مگر صورتِ حالات ہمیشہ یہی نہیں رہتی۔ بلکہ دبی خواہشات ہمیشہ نکاس کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لیتی ہیں ایک طریقہ over-compensation کا ہے جس کی مثال یہ ہے کہ عاشق اپنے جذبۂ عشق کے اظہار کو عموماً اس طرح تسکین بہم پہونچاتا ہے کہ محفل اور دوستوں میں محبوب کا ذکر کسی برائی کے سلسلہ میں خوب مزے لے لے کر بیان کرتا ہے۔ بعض اوقات دبی خواہشات ضد کی صورت اختیار کرلیتی ہیں، جس کو فرائڈ نے 'ایذا رسانی' سے 'ایذا طلبی' کی طرف انتقال سے تعبیر کیا ہے اور جو اس کے نزدیک بہر نوع جنسی ہوا کرتی ہے۔ مگر بعض اوقات حالت دگرگوں ہو جاتی ہے یعنی دبی کچلی خواہشات گاہے گاہے اعصابی امراض باعث ہوتی ہیں، فرائڈ کے نزدیک ان اعصابی امراض مالیخولیا، دیوانگی۔ اختناق الرحم۔ جنون، مرگی کی وجہ سے ننانوے فیصدی جنسی ہوتی ہے اور اس کے خیال میں اگر مریض کے ذہن کو کرید جائے اور اس ذہنی اُلجھن کا پتہ لگا کر تسکین کا سامان کر دیا جائے تو مریض شفایاب ہو سکتا ہے چنانچہ اس کا یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا گو اس سلسلہ کے بعض دیوانگی زدہ مریض طریقِ مذکور سے تندرست نہ ہو سکے۔ لیکن اکثر اس کی افادیت کامیاب رہی لاہور میں فرائڈین طریقۂ علاج کے ماہر ڈاکٹر اشرف مشہور ہیں۔

اب اوپر مذکورۂ بالا "ذہنی گرہ ہوں" اور 'جمالیاتی ذوق' کو مدِ نظر رکھ کر بعض لکھنے والوں کے خیالات کی تحلیلِ نفسی کی جائے تو یقیناً کچھ اس قسم کی جنسی "ذہنی گرہ" کا سراغ مل جائے گا 'جنس' کا اس طرح آزادانہ تذکرہ کرنے والے ترقی پسند ادیبوں کو ہم متہم قرار نہیں دے سکتے گویا اس سلسلہ میں لاشعوری طور پر 'جمالیاتی ذوق' ان کی رہنمائی کر رہا ہے اور وہ بغیر محسوس کئے ایسا کچھ لکھ جاتے ہیں یا پھر کسی دبی ہوئی خواہش نے نکاسی کا اس طرح راستہ ڈھونڈھ نکالا ہے۔

(نگار) آپ کی اس تحریر سے میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ جو حضرات اپنے افسانوں یا مضامین میں فحاشیانہ بیباکیوں سے کام

لیتے ہیں، وہ آپ کے نزدیک اعصابی امراض کے مریض ہیں اور فرائیڈ کے نظریہ سے آپ اس کا استناد کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ صحیح ہو، لیکن سوال یہ نہیں ہے کہ اس نوع کا لٹریچر اعصابی مریضوں کے دماغ کا نتیجہ ہے یا نہیں، بلکہ صرف یہ کہ وہ ادب صحیح (Sound Literature) کہلانے کا مستحق ہے یا نہیں اور لکھنے والوں کی طرف سے جو دلایل اسکے جواز میں پیش کئے جاتے ہیں وہ کس حد تک لایق اعتنا ہیں۔

اگر آپ کے قول کے مطابق یہ لٹریچر مریض کے فکر و نظر کا نتیجہ ہے تو ظاہر ہے کہ اسے بھی سقیم ہونا چاہئے، لیکن لطف یہ ہے کہ اس قسم کا لٹریچر پیش کرنے والے اس کو ادب صحیح سمجھتے ہیں اور اس کے جواز میں اقوال فرائیڈ سے استناد کرکے جنسی عقدہ کشائیوں کا واحد ذریعہ اسی قسم کے لٹریچر کو قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ Realism (حقیقت نگاری) کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جو کچھ ذہن میں ہو بے کم و کاست ظاہر کر دیا جائے۔

اس سلسلہ میں دو باتیں میری سمجھ میں کبھی نہیں آئیں، ایک یہ کہ اگر اس قسم کا ادب اضطراری نتیجۂ فکر ہے تو اس سے قبل کیوں نہیں پایا گیا اور دوسرے یہ کہ اگر وہ واقعی کسی اعصابی مرض کا علاج ہے تو اس سے لوگوں کو شفا کیوں نہیں ہوتی، اور یہ طریق علاج کیوں خود مرض بن کر رہ جاتا ہے۔

اساتذۂ قدیم کے کلام میں بھی فحش نگاری کی مثالیں ہم کو ملتی ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ یہ نتیجہ رہا ہو انکی کسی جنسی گرہ کے کھلنے کا، لیکن نہ انھوں نے اس پر کبھی فخر کیا اور نہ دنیا نے ان کی ادبیت کا معیار قایم کرنے میں اس چیز کو سامنے رکھا۔ لیکن اب کیفیت یہ ہے کہ اس کو معیاری چیز کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے یعنی سوال گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہونے کا نہیں، بلکہ اس سے لطف اُٹھانے اور اس کو سراہنے کا ہے۔

میں نے جہاں تک غور کیا ہے، قصور نہ فرائیڈ کا ہے اور نہ اسکے نظریوں کا، بلکہ آزادی کی غلط تعبیر کا ہے۔ مغرب نے ہم کو جہاں اور درس دئے ہیں، وہیں ایک درس یہ بھی دیا ہے کہ انسان اپنی رائے و فکر میں بالکل آزاد ہے اور ہمارے ملک کے نوجوان اس "حریت فکر و رائے" کے استعمال میں حد اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں۔ یقیناً ذہنی آزادی انسان کا فطری حق ہے، لیکن اگر یہ آزادی سماج کے اخلاقی قانون توڑنے کے لئے استعمال کی جائے تو یہ ذہنی آزادی نہ کہلائیگی بلکہ اس کو "ذہنی انارکی" کہیں گے، جو آجکل کے بعض ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے یہاں پائی جاتی ہے اور جسے ہم نہ "ادب صحیح" کہہ سکتے ہیں اور نہ ہیئت اجتماعی کے لئے مفید۔

جب اول اول یہ رو چلی ہے، تو میں زیادہ مشوش نہ تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ چیز زیادہ چلنے والی نہیں ہے اور اس کا رُخ جلد یا بدیر یقیناً بدلے گا، چنانچہ میرا یہ خیال صحیح نکلا کیونکہ اب آزادہ روی و ترقی پسندی کی دیوانگی کا وہ رنگ نہیں ہے اور ہمارے نوجوانوں کا جوش و ولولہ جو پہلے صرف فرائیڈ کی تائید میں صرف ہوتا تھا، اس میں اب ٹھیراؤ پیدا ہو گیا ہے اور "ادب کاسد" پیش کرنے کی جگہ زیادہ تر "ادب صالح" پیش کیا جا رہا ہے۔

ہر چیز کا ایک دور ہوا کرتا ہے اور جب اس کی ضرورت نہیں ہوتی تو دوسری چیز اس کی جگہ لے لیتی ہے، اس سے قبل ہمارے ادیبوں، شاعروں اور مصنفوں نے جو کچھ پیش کیا، وہ اپنی جگہ یقیناً قابل قدر ہے لیکن اب زمانہ کا مطالبہ کچھ اور ہے اور ہمارے ترقی پسند ادیب اسی مطالبہ کو پورا کر رہے ہیں، اور نظم ہو یا نثر اس میں "ادب برائے حیات" کا پہلو زیادہ نمایاں ہے، اور آہستہ آہستہ غیر ضروری یا مضرت رساں پیداوار از خود کم ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اک کمی بھی ہے اور وہ یہ کہ لکھنے والے زیادہ کاوش سے کام نہیں لیتے، بلکہ میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ وہ شاید اپنی تحریر پر نظر ثانی بھی نہیں کرتے اور اس لئے اس کی صورت بالکل ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی کاریگر پرزہ تو ٹھیک ڈھالے لیکن اس پر صیقل نہ کرے۔

آپ بیشک نظم و نثر دونوں کی ٹکنک کو بدل سکتے ہیں، لیکن جو ٹکنک آپ اختیار کرتے ہیں اُسے تو بے عیب ہونا چاہئے۔ جس طرح دنیا میں ہر پرانی چیز بُری نہیں ہے اسی طرح ہر نئی چیز اچھی بھی نہیں ہو سکتی۔ حسن و قبح کا ایک معیار ہر زمانہ میں پایا جاتا ہے جس کو سماج قایم کرتی ہے اور جس سے ہٹ کر کوئی انفرادی تحریک ترقی نہیں کر سکتی۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

بحر احمر اور مارشیس

کی بندر گاہوں کو مسافر اور مال لیجانے والے جہازوں کا بیڑہ بمبئی سے :۔

عدن، پورٹ سوڈان، جدّہ اور مصر

کی بندر گاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ ہم حسب ضرورت دوسری بندر گاہوں کو بھی اپنے جہاز بھیج سکیں گے

مال اور مسافروں کو بکنگ کے متعلق تفصیلات کے لئے لکھئے :۔

ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ

بنک اسٹریٹ کلکتہ

مالہ و ماعلیہ

جگرؔ۔ سیمابؔ اور ماہرؔ القادری

آجکل کے سالنامہ (۱۹۴۷ء) میں جناب جگرؔ کی ایک غزل شایع ہوئی ہے:۔

ہر وہ حلقہ، جو تری کاکل شبگیر میں ہے
گوشۂ امن، بلا خانۂ زنجیر میں ہے

شاہد روح کہاں۔ جلوہ گہ ناز کہاں
خاک، مصروف ابھی خاک کی تعمیر میں ہے

کون قاصد یہ سمجھتا ہے دمِ رخصتِ شوق
ربط محکم، اسی بے ربطی تحریر میں ہے

دل بھی ہے جلوہ گہ دوست مگر اے واعظ
عیدِ نظارہ، ہلالِ خم شمشیر میں ہے

دیکھنا جبر مشیت، کہ بہ قید زنداں،
پاؤں زنجیر سے باہر ہے نہ زنجیر میں ہے

اپنے سر آپ نہ لیں دلشکنی کا الزام،
مجھ کو معلوم ہے جو کچھ مری تقدیر میں ہے

خود کھچے آتے ہیں زنداں کی طرف دیوانے
کوئی تو وجہ کشش نالۂ زنجیر میں ہے

چھپ کے پہروں اسے اور دیکھنے والے یہ بتا
مجھ میں کیا بات نہیں، جو مری تصویر میں ہے

پہلے شعر میں "کاکل شبگیر" کی ترکیب غلط ہے۔ شب گیر دو معنی میں آتا ہے، ایک بہ معنی سحر اور دوسرے بہ معنی "کوچ آخر شب"۔ مظہر کاشی کا شعر ہے:

ساقیا شبگیر شد شمع شبستانی بیار
بزم روحانی بپاکن جام ریحانی بیار،

اس شعر میں "شبگیر شد" بہ معنی "سحر شد" استعمال ہوا ہے اور "نالۂ شبگیر" نالۂ صبحگاہی کو کہتے ہیں۔ تنہا کا شعر ہے:

بمن تا داشت لطفش گوشۂ چشمے براہ او
زگرد سرمہ از خود نالۂ شبگیر میکردم،

کوچ کے مفہوم میں فردوسی کا شعر ملاحظہ ہو:

بہ شمشیر شبگیرہا برکشیم،
ہمہ دامن کوہ لشکر کشیم

جگرؔ صاحب شب گیر کے معنے شبگوں سمجھتے ہیں، جو بالکل غلط ہے۔

علاوہ اس کے شعر اپنے مفہوم کے لحاظ سے بھی ناقص ہے، شاعر نے کاکل کے دو حصے کئے ہیں ایک وہ جس میں حلقے ہیں اور دوسرا وہ جس میں حلقے نہیں ہیں۔ دوسرے حصہ کو وہ بلاخانۂ زنجیر کہتے ہیں اور پہلے حصہ کو گوشۂ امن۔ لیکن یہ تفریق و امتیاز کیوں ہے۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر کاکل بلاخانۂ زنجیر ہے تو حلقے ہوں یا نہ ہوں بلاخانہ ہے۔ حلقہ میں وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اسے گوشۂ امن قرار دیا گیا۔

دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ بے معنی ہے۔ خاک کا خاک کی تعمیر میں مصروف رہنا کوئی معنی نہیں رکھتا اگر دوسری جگہ بجائے خاک کے حسن ہوتا تو بھی غنیمت تھا اور تاویل کر کے کوئی مفہوم پیدا کیا جا سکتا تھا۔

تیسرا شعر بھی کوئی مفہوم نہیں رکھتا۔ اگر یہ کا اشارہ دوسرے مصرعہ کی عبارت کی طرف ہے تو اس کے معنے یہ ہونگے کہ شاعر قاصد سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ "دمِ رخصت شوق، کون یہ بات سمجھتا ہے کہ بے ربطی تحریر ہی ربط محکم ہے" اور اس کا اہمال ظاہر ہے، قاصد اور تحریر دو چیزوں کے اظہار سے یہ بات ظاہر ہے کہ عاشق کوئی تحریر قاصد کو دیکر محبوب کے پاس روانہ کر رہا ہے اور قاصد اس تحریر کو دیکھ کر اعتراض کرتا ہے کہ تحریر بہت بے ربط ہے جس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ تحریر کی بے ربطی ہی ربط محکم ہے — اگر جگر صاحب نے یہ شعر اسی مفہوم میں لکھا ہے تو "دمِ رخصتِ شوق" کا ٹکڑا بالکل بیکار ہے اور "کون سمجھتا ہے" کے استعمال کا بھی کوئی موقعہ نہیں۔ علاوہ اسکے "رخصتِ شوق" کی ترکیب بھی صحیح نہیں۔ رخصت کے معنے اجازت کے ہیں اور شوق کے معنے آرزو یا تمنا کے ہیں، اس لئے جب تک رخصت اور شوق کے درمیان لفظ اظہار نہ آئے، کوئی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔ اگر پہلا مصرعہ یوں ہوتا:۔

نامۂ شوق ہے قاصد یہ، تجھے کیا، لے جا

چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ غزل کا ہے اور دوسرا نظم کا، کیونکہ اس کا تعلق قومیات سے ہے، علاوہ اسکے ہلال کو تو عید نظارہ کہہ سکتے ہیں، لیکن ہلال میں عید نظارہ کا ہونا بے معنی سی بات ہے۔ اے واعظ کا ٹکڑا بھی یہاں بالکل بے محل ہے۔ کیا واعظ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ عید نظارہ کا تعلق ہلالِ خمِ شمشیر سے ہے۔ اگر واعظ سیاسی ہے تو وہ بھی یہی کہے گا اور اگر سیاسی نہیں ہے تو اس سے خطاب کر کے ایسی بات کہنا جس سے اُسے کوئی تعلق ہی نہیں، بیکار ہے۔

پانچویں شعر میں جبر مشیت کا استعمال اگر صحیح مانا جائے تو دوسرا مصرعہ بہ لحاظ مفہوم نادرست ہے۔ کیونکہ جبر کے مفہوم کو سامنے رکھ کر یوں کہنا چاہئے تھا کہ پاؤں زنجیر سے باہر ہے مگر پھر بھی زنجیر میں ہے۔ پاؤں کا نہ زنجیر سے باہر ہونا نہ زنجیر سے اندر ہونا۔ یہ تو مشیت کا سحر و افسوں ہے نہ کہ جبر۔

باقی تین شعر گو معمولی ہیں لیکن بے عیب ہیں۔ آخری شعر کا پہلا مصرعہ اُلجھا ہوا ہے اور "اُسے او" کا تلفظ زبان و گوش دونوں کے لئے بار ہے۔

سیماب

آجکل کی اسی اشاعت میں جناب سیماب کی بھی ایک نظم، علم و خبر کے عنوان سے شایع ہوئی ہے۔ جسکے اکثر اشعار میں تغزل پایا جاتا ہے۔ نظم بے عیب ہے، لیکن پہلے شعر کے پہلے مصرعہ میں سبزہ نکھر گیا کی جگہ سبزہ نکھر آیا لکھا گیا ہے۔ (مصرعہ یہ ہے:۔ پھولوں سے حجاب اُٹھے سبزہ بھی نکھر آیا)

اسی نظم کا ایک شعر ہے:۔

ہر قطرۂ خوں میرا تحلیل ہوا لیکن، تصویر محبت میں اک رنگ تو بھر آیا

یہاں لفظ تحلیل کا صرف غلط ہے۔ تحلیل کہتے ہیں کسی چیز کو گھلا کر فنا کر دینا اور اسی لئے تحلیل ان اشیاء کے لئے استعمال ہوتا ہے جو جامد و سخت ہیں۔ اور خون چونکہ رقیق چیز ہے اس لئے اس کے لئے تحلیل کا لفظ استعمال کرنا درست نہیں یہ مصرعہ یوں ہوتا تو بہتر تھا:۔ ہر قطرۂ خوں میرا گو صرف ہوا لیکن

ماہر القادری

اسی اشاعت میں فکر و پیام کے عنوان سے جناب ماہر القادری کی بھی ایک نظم شایع ہوئی ہے جس کے ایک شعر میں انھوں نے عجیب قسم کی غلطی کی ہے۔ شعر یہ ہے:۔

گھٹائیں چشم عنایت ادھر نہ فرمائیں، نہیں ہیں باغ یہ انگور کے، یہ ہے فالیز

فالیز سے فارسی میں جالیز بھی کہتے، خربزہ وغیرہ کی کاشت کو کہتے ہیں جسے بارش کی ضرورت بہت کم ہوتی ہے، لیکن ماہر صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ فالیز کی طرح تاکستان (باغ انگور) کو بھی بارش موافق نہیں آتی۔ علاوہ اس کے پہلے مصرع میں بھی ایک نقص ہے وہ یہ کہ محاورہ عنایت فرمانا ہے، نہ کہ "چشم عنایت فرمانا" اسی نظم کا ایک مصرعہ ہے:۔

قدم بڑھائے چلا جا ابھی کچھ اور بھی تیز

اس میں کچھ اور بھی تیز کا فقرہ بیکار ہے۔ قدم بڑھائے چلا میں یہ مفہوم شامل ہے۔

فراق

اسی اشاعت میں فراق کی بھی دو غزلیں نظر آتی ہیں جس کے بعض مصرعے تقطیع سے خارج ہیں۔ مثلاً:۔

کتنے پانی میں ہے حسن، عشق ہے کتنے پانی میں

مسولینی کے قتل کی داستان

(کرنل ولیریو کی زبان سے)

میں نے مسولینی کو ادائے فرض کے سلسلہ میں گولیوں کا نشانہ بنایا اور جب جانکنی کے وقت اس کا جسم کانپ رہا تھا تو نہ کوئی جذبۂ نفرت و افتخار میرے اندر پایا جاتا تھا، نہ جذبۂ غرور و ہمدردی۔ جب اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا تو اطمینان و سکون کا احساس ضرور مجھے تھا کیونکہ میں نے قومی عدالت کے حکم کی تعمیل کی تھی اور مسولینی کی موت کے بعد میں اپنے فرض سے ادا ہو گیا تھا، لیکن تھوڑی سی حیرت ضرور تھی کہ مسولینی صورت تو شیر کی سی رکھتا تھا، لیکن دل ویسا نہ تھا اور اس نے بہادر کی طرح جان نہیں دی۔

۲۷ اپریل ۴۵ء ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے شب کو ٹریزی گارڈ کے افسر نے فون پر ہم کو اطلاع دی کہ مسولینی گرفتار ہو گیا ہے۔ اس کے بعد رات کو ساڑھے گیارہ بجے اور ایک بجکر بیس منٹ پر اور اطلاعات بھی ہم کو ملیں جس سے مسولینی کی گرفتاری کی پوری تفصیل معلوم ہوئی۔

۲۷ اپریل کی صبح کو ۸ بجے نازیوں اور فاسسٹیوں کا ایک دستہ بمقام ڈونگو گرفتار ہوا اور اس میں مسولینی بھی تھا جو ایک جرمن ٹینک میں چھپا ہوا تھا، جس کا علم اُسوقت کسی کو نہ تھا۔ جب آزاد فوج کے سپاہی اپنے قیدیوں کی تلاش لینے لگے تو مسولینی چپکے سے ٹینک چھوڑ کر ایک جرمن لاری میں جا کر کمبلوں کے ڈھیر میں چھپ گیا۔ لیکن جب لاری کی تلاشی ہوئی اور اس کا پتہ چلا تو اس نے کہا کہ "نازی سپاہی مجھے پریشان کرنے کے لئے کمبلوں کے نیچے دبا کر چلے گئے" وہ سمجھتا تھا کہ یہ لوگ اسے پہچانے گے نہیں اور نازیوں کی شکایت کرنے سے اسے دوست سمجھ کر رہا کر دیں گے، لیکن اسکی یہ ترکیب کارگر نہ ہوئی اور سپاہی اس کو معہ اس کی محبوبہ کلارا اور پچاس دوسرے فاسسٹیوں کے پکڑ کر ایک کسان کے مکان میں لے گئے جو قریب ہی واقع تھا۔

اس کے بعد ساری رات قومی عدالت اپنا کام کرتی رہی اور ٹھیک ایک بجکر ۲۰ منٹ پر مجھ کو یہ حکم ہوا کہ فوراً ڈونگو جا کر حکم نمبر ۵[1] کی تعمیل کروں۔ لیکن مجھے کوئی ہدایت نہیں کی گئی کہ ۱۵ قیدیوں میں سے کس کس کو قتل کیا جائے۔ یہ فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

---

[1] حکم نمبر ۵ سے ۱۵ قتل و قصاص یا حبس دوام کا حکم ہے۔

چونکہ مجھ کو صرف ۲۴ گھنٹے کی مہلت تعمیل حکم کے لئے دی گئی تھی، اس لئے میں نے فوراً تیرہ قابل اعتماد سپاہی انتخاب کئے اور ایک سیاہ رنگ کی نئی فیاٹ موٹر کار اور ایک لاری میں گیس پوری طرح بھر کر جانے کے لئے طیار ہو گیا۔ میں نے بندوق و ریوالور کی بھی اچھی طرح جانچ کر لی کہ وہ ٹھیک ہیں یا نہیں اور صبح بہت سویرے میلان سے شمال کی طرف روانہ ہوا۔ میرے تیرہ ساتھی بالکل لاعلم تھے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور انھیں کیا کرنا ہے۔ لیکن روانگی سے قبل میں نے خفیہ طور پر اُن کے افسر کو ضرور بتا دیا تھا کہ اس سفر کا کیا مقصد ہے۔ دوسرے لوگوں سے میں نے صرف اتنا کہدیا تھا کہ تم کسی کا مقابلہ کرنے نہیں جا رہے ہو، لیکن ممکن ہے اس کی بھی ضرورت ہو اس لئے تمھیں اسکے لئے بھی طیار رہنا چاہئے۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس وقت جبکہ میں صبح کو سنسان سڑک پر چلا جا رہا تھا، میرے دل و دماغ کن خیالات سے معمور تھے۔ میں نے مسولینی کو کبھی نہ دیکھا تھا اور اس کے عہد میں کامل ۵ سال تک سیاسی قیدی کی حیثیت سے زندگی بسر کر چکا تھا، اس لئے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ کس صورت کا انسان ہوگا، وہ کیا کہے گا اور اپنی موت کی پذیرائی کیونکر کرے گا، لیکن سب سے زیادہ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ وقت نہ خراب ہو اور میں متعینہ وقت کے اندر اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکوں۔ کیونکہ خوف یہ بھی تھا کہ ممکن ہے ہماری جماعت کے جاسوسوں کو ہمارے اس سفر کا مقصد معلوم ہو جائے اور نازی سپاہی ہم کو آگے نہ بڑھنے دیں۔

میں ۸ بجے صبح کو مو پہونچا، شہر میں اس وقت ہنگامہ مچا ہوا تھا، میں سیدھا پولیس کے دفتر میں پہونچا اور میں نے کہا کہ ہم لوگ اُن فاسسٹ لیڈروں کے مسئلہ کے سلسلہ میں سفر کر رہے ہیں جو ڈونگو میں گرفتار ہوئے ہیں۔ ایک شخص نے کہا کہ "وہ کل یہیں کو مولائے جائیں گے"۔ میں نے کہا کہ "ان کے متعلق مجھے قومی عدالت عظمیٰ کی ہدایات موصول ہوئی ہیں اور میں ان پر عمل کروں گا، اس لئے فوراً ایک بند ٹرک کا انتظام کر دیا جائے تاکہ میں اپنے سپاہیوں کو لے جا سکوں"۔ میرے اس اصرار پر افسران پولیس میں کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور ان کے چہروں سے وحشت و پریشانی سی ٹپکنے لگی، کیونکہ فاسسٹی زمانہ کی ہیبت ان کے دلوں سے پوری طرح دور نہ ہوئی تھی۔ وہ ایک بند کمرہ کے اندر چلے گئے تاکہ اس مسئلہ پر غور کریں۔ پھر فوراً میلان کو فون کیا اور وہاں سے جواب آیا کہ مقامی افسران کا فیصلہ کوئی چیز نہیں ہے، سابق حکم کی فوراً تعمیل کی جائے۔

مجھے یہاں دو گھنٹے انتظار کرنا پڑا اور ٹھیک ۱۱ بجکر ۲۰ منٹ پر مجھے ایک شکستہ ٹرک دیا گیا۔ میں نے دوسرا ٹرک طلب کیا اور پھر کافی انتظار کے بعد ایک امبولنس کار فراہم کی گئی۔ میں غصہ سے بیتاب تھا اور دیر ہو جانے کی وجہ سے ڈر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مقررہ وقت ختم ہو جائے اور مجھ سے باز پرس کی جائے، میں وہاں کے کمانڈر اور پریسیڈنٹ سے ملا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس لئے میں نے دو مسافر لے جانے والی لاریاں پکڑیں اور میرے سپاہی کسی نہ کسی طرح ان میں گھس پل کر بیٹھ گئے، میں نے یہاں کے کمانڈر اور پریسیڈنٹ کو بھی ساتھ لیا تاکہ راستہ روک ٹوک کے بغیر طے ہو سکے

جونہی ہم کومو سے روانہ ہوئے، ہمارے سب سے پہلی اتحادی فوج داخل ہوئی اور لوگوں میں کھلبلی سی مچگئی۔ میں نے اپنے شوفر سے کہا کہ پوری رفتار سے چلو کیونکہ وقت بہت کم رہگیا تھا۔ اتفاق سے اسی وقت ایک بڑا ٹرک ہمارے پاس سے گزرا۔ میں نے فوراً اسے پکڑا اور اس میں سب کو بٹھا کر چل پڑا۔

۲ بجکر دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ ہم ڈانگو پہونچے اور قومی فوج کے سپاہیوں نے ہمیں دشمن سمجھ کر اپنی رائفلیں سیدھی کرلیں، لیکن جب انھیں ہمارا مقصد معلوم ہوا تو ان کے افسر نے ہمیں ۱۵ قیدیوں کی فہرست دیدی اور اس طرح مجھے موقعہ ملا کہ میں حکم نمبر ۵ کی تعمیل کرسکوں۔

اس حکم کے الفاظ یہ تھے۔

"چونکہ فاسسٹ حکومت کے لیڈروں نے قوم کی آزادی چھین کر ملک کا مستقبل تباہ کرنے کی کوشش کی تھی اس لئے ان کو سزائے موت دیجاتی ہے، لیکن وہ لوگ جنھوں نے کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا انھیں حبس دوام کی سزا دیجائے۔ اس حکم کی تعمیل کو قومی عدالت کے ذریعہ سے کی جائے۔"

میں نے یہاں کے کمانڈر سے کہکر فوجی عدالت طلب کی اور ۱۵ قیدیوں میں سے سترہ میں نے سزائے موت کے لئے منتخب کرلئے جن میں مسولینی تو شامل تھا، لیکن اس کی محبوبہ کلارا رانہ تھی۔ تمام قیدی اس وقت ایک مقام بنزمینگو میں تھے۔ میں ۳ بجکر ۱۰ منٹ پر وہاں روانہ ہوا اور جاتے ہوئے راستہ ہی میں ایک جگہ قتل و قصاص کے لئے منتخب کرلی۔ سڑک کے موڑ پر ایک سنسان باغ تھا اور اس میں ایک غیر آباد مکان تھا اسی جگہ کو میں نے مناسب سمجھا، لیکن اس کا اظہار میں نے کسی سے نہیں کیا۔ میں نے چند گز آگے چل کر پھر اپنی بندوق اور ریوالور کی جانچ کی اور ان کو بالکل درست حالت میں پایا۔

ہم خاموش سڑک پر چلے جارہے تھے کہ میں نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا کہ "تمھیں معلوم ہے ہم وہاں جاکر مسولینی سے کیا کہیں گے؟ اس نے کہا "مجھے معلوم نہیں"۔ میں نے کہا کہ "میں کہونگا کہ ہم لوگ تمھیں آزاد کرنے آئے ہیں"۔ میرے ساتھی نے کہا "وہ ایسا بیوقوف نہیں ہے کہ اس کا یقین کرلے"۔ میں نے کہا کہ "دیکھنا وہ ضرور یقین کرلیگا"۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کیوں یہ خیال میرے ذہن میں آیا تھا، شاید اس لئے کہ مسولینی آسانی سے میرے ساتھ آجائے اور غالباً یہ دیکھنے کے لئے بھی کہ مسولینی ایسا بڑا انسان بیوقوف بنایا جاسکتا ہے یا نہیں۔

وہ مکان جس میں قیدی بند تھے ایک پہاڑی کی ڈھال پر واقع تھا۔ میں نے سنتریوں سے گفتگو کی اور تنہا اندر گیا اور مسولینی کو سب سے پہلی مرتبہ دیکھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دیکھئے مسولینی کیا کہتا ہے اور اپنے انجام پر ہنستا ہے یا روتا ہے۔

جب وہ گرفتار ہوا تھا تو سپاہیوں نے اس سے کہا تھا کہ اپنی گرفتاری کی پوری تفصیل خود اپنے قلم سے لکھدو۔

چنانچہ اس نے قلم لیکر لکھا کہ "آج ۲۷ اپریل کو ڈانگو کے سنٹرل اسکویر میں ۵۲ نمبر کی گریبالڈی بریگیڈ نے مجھے گرفتار کیا"
سپاہیوں کے افسر نے طنزیہ لہجہ میں کہا کہ "یہ بھی لکھدو کہ گرفتاری کے بعد مجھ سے برا سلوک کیا گیا اور مجھے بھوکا رکھا گیا"۔ مسولینی نے قلم اُٹھایا اور لکھا کہ "گرفتاری کے وقت اور اس کے بعد مجھ سے مناسب سلوک کیا گیا اور یہ لکھ کر اپنے دستخط کر دئے۔

چونکہ یہ حال مجھے معلوم تھا اس لئے میں سمجھتا تھا کہ مسولینی اپنے وقار کو اب بھی قایم رکھے گا، لیکن میں نے خلاف توقع اسے نہایت دہشت زدہ حالت میں پایا۔ میں اس وقت قومی فوج کی خاکی وردی پہنے ہوئے تھا اور سہ رنگی فیتا میرے بازو پر تھا اور کرنل کے درجہ کا تین ستارہ والا نشان میرے سینہ پر۔ بندوق میرے ہاتھ میں تھی اور ریوالور کمر میں۔

مسولینی فاسسٹی وردی میں اپنے بستر کے پاس کھڑا ہوا تھا اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ وہ مجھے ایک پھنسے ہوئے جانور کی طرح دیکھ رہا تھا اور اس کا نیچے کا ہونٹ کانپ رہا تھا۔ وہ بمشکل تمام پوچھ سکا کہ:
"کیا بات ہے"۔

میں نے کہا: "میں تمھیں آزاد کرنے آیا ہوں"۔ اس کو اس کا بالکل یقین آگیا اور فوراً ہی پھر شہنشاہ معلوم ہونے لگا۔ میں خیال کر رہا تھا کہ میں کسی بڑے انسان کو اپنی گولی کا نشانہ بناؤں گا لیکن مسولینی کے انداز دیکھ کر مجھے افسوس ہوا کیونکہ اپنی عقل و ذہنیت کے لحاظ سے وہ بہت معمولی انسان نکلا۔

اس نے شاہانہ انداز سے سوال کیا: "ہم کہاں چلیں گے"۔ میں نے پوچھا "کیا آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے"۔
اس نے کہا: "نہیں" اور دروازہ کی طرف بڑھ کر خود ہی کہا کہ "آؤ چلیں"

جس وقت یہ گفتگو ہو رہی تھی اس کی محبوبہ کلارا اپنے بستر پر چادر اوڑھے ہوئے لیٹی تھی، لیکن مسولینی نے ایک بار بھی اس طرف نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کے وجود کی اُسے خبر ہی نہیں ہے۔ میں نے کلارا سے کہا کہ "پہلے تم چلو"۔ وہ مسکرا کر کپڑے ٹٹولنے لگی اور بولی کہ "میرے پاس underwear نہیں ہے" وہ اس وقت سیاہ ریشمی سایہ پہنے ہوئے تھی اور اس کے نیچے کوئی دوسرا کپڑا نہ تھا۔ میں نے کہا کہ "چلو، تم اب جوان نہیں ہو کہ اس کی فکر کرو"۔

مسولینی دروازہ کی طرف بڑھا اور دہلیز پر پہونچکر میری طرف مڑ کر پورے شاہانہ انداز کے ساتھ بولا کہ:-
"میں تمھیں سلطنت دینے کا وعدہ کرتا ہوں"۔

جب یہ دونوں موٹر میں بیٹھ چکے تو میں بھی بندوق لئے ہوئے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ کچھ سوچ کر بولا کہ:-
"اپنی ٹوپی اُتار دو ورنہ لوگ پہچان جائیں گے"۔ یہ کہکر اس نے اپنی ٹوپی اُتار لی۔ لیکن پھر خود ہی بولا کہ "میرے گنجے سر کو

بھی دیکھ کر پہچان جائیں گے"۔ میں نے کہا کہ "ٹوپی پہن لیجئے، مناسب یہی ہے"۔ چنانچہ اس نے ٹوپی پھر پہن لی۔
کار آہستہ آہستہ پہاڑی سے نیچے اُتر رہی تھی، جب وہ اس جگہ پہونچی جسے میں نے قتل کے لئے منتخب کیا تھا تو میں نے دیکھا کوئی آس پاس موجود تو نہیں ہے اور سناٹا دیکھ کر میں نے شوفر کو کار ٹھہرانے کا حکم دیا اور مسولینی سے کہا کہ "اُتر کر سامنے کی دیوار کی طرف چلئے"۔ وہ چلا لیکن کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ جب دیوار تک پہونچکر اس نے مڑ کر مجھے دیکھا تو میں نے اس کو قومی عدالت کا حکم سنایا۔
اس وقت یہاں صرف چند آدمی تھے۔ مسولینی، اس کی محبوبہ، ایک سویلین افسر اور میں۔ ۴ بجے شام کا وقت تھا، ہوا میں سکون تھا اور ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جب میں نے حکم پڑھ کر سنایا تو کلارا چیخ اُٹھی "نہیں نہیں مسولینی کبھی قتل نہیں ہو سکتا"۔
مسولینی کا سارا جسم اس وقت کانپ رہا تھا اور وہ بمشکل تمام یہ چند الفاظ کہہ سکا — "لیکن — لیکن — کرنل — لیکن — لیکن — کرنل"۔
میں نے اپنی بندوق اُٹھائی اور کلارا سے کہا کہ "الگ ہٹ جاؤ ورنہ تم بھی ماری جاؤ گی" وہ ایک طرف کو ہٹ گئی اور میں نے بندوق کی لبلبی دبائی، لیکن فیر نہ ہوا۔ کلارا پھر چیختی ہوئی مسولینی کی طرف بڑھی اور اسکے گلے میں باہیں ڈال دیں، لیکن خود مسولینی کا یہ عالم تھا گویا اسے کچھ خبر ہی نہیں ہے۔ وہ رو رہی تھی، چیخ رہی تھی، لیکن مسولینی دیوانہ وار ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، نہ اس نے کلارا سے بات کی، نہ اپنی ماں، بیوی اور بچوں کے متعلق کچھ کہا۔
میں نے کلارا سے چیخکر کہا کہ "ہٹ جاؤ" اور بندوق پھینک کر ریوالور سر کرنا چاہا، لیکن وہ بھی فیر نہ ہوا۔ میں نے فوراً اپنے ساتھی کی رائفل لیلی اور پے در پے پانچ گولیاں اس کے جسم کے اندر پہونچائیں۔ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑا، لیکن مرا نہیں، میں نے ایک گولی سے کلارا کو ٹھنڈا کیا اور پھر مسولینی کے قریب جاکر اسکے دل کی جگہ گولی لگائی اور آخر کار وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔

توقیت ۸ر — نقشہائے رنگ رنگ ۴ر
ریاض نمبر - بجائے ایکروپیہ صرف ۸ر کے ٹکٹ بھیجکر حاصل کیجئے
مذہب اور فلسفۂ مذہب
دونوں مع محصول دو روپیہ میں

(زیر طبع)
"من و یزداں"
حضرت نیاز کے مذہبی مقالات
"مطالعات نیاز"
تاریخی و علمی مقالات کا مجموعہ

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

دلچسپ معلومات

قحط بنگال کا ایک دردناک منظر

اس وقت ساری دنیا قحط کی گرفت میں ہے اور یہ گرفت روز بروز سخت ہوتی جارہی ہے۔ خود ہمارے ملک کے بعض حصّے اس دور ابتلا سے گزر رہے ہیں اور جو باقی ہیں وہ بھی شاید نہ بچ سکیں۔ لیکن وہ لوگ جن کو کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے قحط کے حقیقی مفہوم اور اس کے جانگداز منظر سے بے خبر رہتے ہیں۔

پچھلے قحطِ بنگال میں انسانیت جس درد و کرب کے دور سے گزر چکی ہے اس کی صحیح تاریخ تو شاید کبھی مرتب ہو سکے لیکن بعض لوگوں کے چشم دید بیانات سے تھوڑا سا اندازہ اس بات کا ضرور ہو سکتا ہے کہ خدا اپنے بندوں سے کتنے عرصہ تک بنگال میں روٹھا رہا اور اس کی بے نیازی کیسے کیسے دل ہلا دینے والے مناظر کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرتی رہی۔

حال ہی میں امریکہ کے فوجی ڈاکٹر جان فریڈرک میوہل نے اپنا ایک نہایت ہی سرسری مطالعہ پیش کیا ہے جو انھوں نے قحطِ بنگال کے دوران میں کیا، اور جس سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا میں دولت کی تقسیم کس درجہ غیر متوازن ہے۔ اور ایک غریب انسان کی جان ایک دولتمند انسان کے مقابلہ میں کتنی ارزاں، بیکار اور ذلیل خیال کی جاتی ہے۔

وہ لکھتا ہے:۔ "میں کلکتہ پہونچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا، ایک جانب سامان عیش فراہم تھا، شاندار ہوٹلوں اور عالیشان قہوہ خانوں میں لذیذ کھانوں کی افراط تھی اور دوسری جانب بھوکوں کی چیخ و پکار۔ تنگ و تاریک گلیوں میں رہنے والے رینگتے اور تڑپتے ہوئے بھکاریوں اور اچھوتوں کو چاول اور باجرہ کا ایک دانہ تک نصیب نہ تھا اور وہ اپنے ننگے اور خالی پیٹوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خوشحال لوگوں کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے اور جب وہ شانِ استغنا سے گزر جاتے تو فاقہ زدہ مخلوق بے جان اور مردہ ہو کر کسی نالی کے کنارے گر پڑتی اور لاش اُٹھا لیجانے والی گاڑی کا انتظار کرتی رہتی۔

"صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ اس قحط میں کتنی جانیں ضایع ہوئیں۔ زندگی ارزاں تھی مگر چاول گراں۔ بے شمار جسم جلا دئے گئے پھر بھی سینکڑوں جہاں پڑے تھے وہیں پڑے رہے۔ انسانی گوشت کتوں کا ماحضر بنا ہوا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ ادھر فاقہ کش نے آخری سانس اور ادھر کتے اس پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے خود دیکھا کہ ایک شخص کی نیم جاں لاش کو کتے نوچ رہے تھے اور اسکی بیوی جو خود بھی فاقوں کی وجہ سے مر رہی تھی اپنے شوہر کی لاش کو ان کتوں سے چھیننے کے لئے

جنگ کر رہی تھی۔

"ہر جانب سے کراہنے اور آہیں بھرنے کی دردناک صدائیں آ رہی تھیں اور فاقہ زدوں کی جماعت لوگوں کی ٹانگوں سے لپٹ کر "صاحب! صاحب!" کی آوازیں لگاتی۔ لیکن وہ کوئی توجہ نہ کرتے۔ ہوٹلوں کے آگے ہر وقت سیکڑوں سسکتی ہوئی جانیں پڑی رہتیں۔ اسی کے ساتھ اندھیروں اور دھندلکوں میں بھوکی نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ جو اخلاق سوز سلوک کئے گئے ان کا بیان غالباً مناسب نہیں۔

"میں نے دیکھا ایک جگہ انگریزی عورتیں بات چیت کر رہی تھیں۔ ایک نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: "قحط کی وجہ سے ہم کو ناقابلِ بیان صعوبتیں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔ سڑکوں پر چلنا دشوار ہے۔ ننگی بھوکی مخلوق ہم کو نوچنے دوڑتی ہے۔ ہمارے کھانے کے برتن ہفتہ میں دو دو بار غائب ہو جاتے ہیں۔

دوسرے روز میں مردہ جلانے کا میدان دیکھنے گیا۔ دروازے ہی سے تڑپا دینے والی بدبو نے دماغ پریشان کر دیا مردہ جسموں کو لکڑیوں کے بستر پر لٹا کر ان پر تیل چھڑک کر آگ لگائی جا رہی تھی — اس کے بعد ہی اطلاع ملی کہ اور لاشیں اٹھانے کی جلد ضرورت ہے۔

"ہم لوگ انتظام قحط کے ایک دفتر میں پہونچے۔ دیکھا کہ ایک بورا چاول کا ہزاروں بھوکے لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا ہے اور دوسری جانب میدان میں مردہ جسم اکٹھا کئے جا رہے ہیں۔

شام کو ایک میجر سے ان انتظامی مرکزوں کے بارے میں بات چیت کی۔ اس نے کہا کہ قحط کا انسداد چاولوں کے چند بوروں سے نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس تقسیم غلہ سے ایک بڑا فایدہ یہ ہے کہ مٹھی بھر چاولوں کے لالچ میں وہ ایکدوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اگر ہم ان کا پیٹ بھرنے میں نہیں تو کم از کم ان کے مردہ جسموں کو جمع کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔

اب بھی بنگال میں صدہا علامات اور نشانات اس قحطِ عظیم کی غمازی کر رہے ہیں۔ اب بھی آدھی آبادی بے دست و پا اور مفلوک الحال نظر آتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں خوشحال لوگوں کی بے رحمی اور حیوانیت اس قحط کا سب سے بڑا سبب ہے

چوروں کا باضابطہ ادارہ

جارج ڈگبی نے اپنی سیاحت چین کے سلسلہ میں ایک عجیب و غریب واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے کہ ایک دن شنگھائی کے ضلع ننگ پو میں بہ سلسلۂ ٹیکس ٹورنامنٹ کچھ انگریز مدعو تھے اور جیتنے والوں کو چاندی کی کچھ چیزیں انعام میں دیجانے والی تھیں۔ شام کو جب تقسیم انعام کا وقت آیا تو معلوم ہوا کہ وہ چیزیں سب کی سب غائب ہیں اور باوجود تلاش کے کہیں نہ ملیں — میزبان نے اپنے ملازم سے پوچھا کہ — "تم نے امسال چوروں کا ٹیکس ادا کر دیا ہے یا نہیں"۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ یہ ٹیکس ایک ایک پائی ادا ہو چکا ہے، تو اس نے کہا کہ چوروں کے پریسیڈنٹ کو بلایا جائے۔

ایک گھنٹہ کے بعد پریسیڈنٹ آیا۔ یہ اچھی خاصی شریفانہ صورت کا ایک معمر انسان تھا جو سفید ریشمی عبا اور ٹوپی پہنے ہوئے تھا اور اس کو دیکھ کر کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ چور یا چوروں کا سردار ہو سکتا ہے۔ میزبان نے اس سے سارا واقعہ بیان کیا اور اس نے چُرائی ہوئی چیزوں کی فہرست معلوم کر کے وعدہ کیا کہ کل شام تک یہ چیزیں آپ کو واپس ملجائیں گی۔"

میں یہ سنکر حیران رہگیا اور اپنے میزبان سے دریافت کیا کہ یہ کیا قصہ ہے اور یہ شخص کیونکر چور کو گرفتار کرسکے گا۔ اس نے کہا کہ یہ شخص چوری کے معاملہ میں "اسکاٹ لینڈ یارڈ" سے زیادہ مفید و کارآمد ہے کیونکہ چین میں جس طرح اور تمام پیشہ وروں کے جتھے ہیں، اسی طرح گداگروں اور چوروں کے بھی ہیں اور ان کا ایک سردار ہوتا ہے جو ان پر حکومت کرتا ہے۔ چونکہ چین میں سماجی نظام بہت پیچیدہ ہے اور وہاں اشیاء کی طلب و فراہمی بالکل متوازن ہے اس لئے وہاں چوری کو برداشت نہیں کیا جا سکتا اور اس کے انسداد کی یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ وہ افراد جو چور ہیں یا بیکاری کی وجہ سے چور بن سکتے ہیں، ان سب کی سوسائٹی بنادی گئی اور ایک پریسیڈنٹ مقرر کر کے اُسے ذمہ دار بنادیا گیا کہ سوسائٹی کا فرد چوری نہ کرے اور پبلک نے اس بات کی ذمہ داری لی کہ وہ سوسائٹی کے تمام افراد کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ایک فنڈ قایم کردے، چنانچہ چین کے ہر شہر میں چوروں کی یہ سوسائٹیاں قایم ہیں اور شہر کا ہر باشندہ ایک مقررہ رقم بطور ٹیکس کے ادا کرتا ہے، چنانچہ میں بھی سالانہ ۸ شلنگ (چھ روپیہ) ادا کرتا ہوں اور اس تھوڑی سی رقم ادا کرنے کے بعد مجھے چوری کی طرف سے اطمینان حاصل ہے۔ جس گھر کا ٹیکس ادا ہو جاتا ہے اسکے دروازہ پر چوروں کی سوسائٹی کی طرف سے ایک خاص نشان بنادیا جاتا ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ اب ایکسال تک اس گھر میں چوری کا امکان نہیں ہے۔"

دوسرے دن شام کو میں اپنے میزبان کے ساتھ چاء پی رہا تھا کہ چوروں کا سردار آیا، اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے، جو ایک نوجوان شخص کے گلے میں رسی ڈالے ہوئے گھسیٹتے چلے آرہے تھے، سردار نے تمام مسروقہ چیزیں واپس کیں اور کہا کہ "اب اس شخص کو سزا دیجائے گی آپ لوگ بھی دیکھئے"، یہ سنتے ہی سب نے مخالفت کی، لیکن میزبان نے کہا کہ آپ لوگ اس معاملہ میں دخل نہ دیں اور جو اصول ان کے مقرر ہیں انھیں برتنے دیجئے، آپ لوگ اگر دیکھنا پسند نہ کریں تو چلے جائیے، مگر مجھے تو یہاں زندگی بسر کرنا ہے اور ان کے کہنے پر چلنا پڑے گا۔

یہ سنکر اکثر وہاں سے اُٹھ کر چلے گئے اور سردار نے چور کو ایک بنچ سے باندھ کر اس کے کپڑے اُتارے اور دو مضبوط آدمیوں نے دونوں طرف سے بانس کی مضبوط چھڑیاں پنڈلیوں سے لیکر شانے تک اتنی زور زور سے مارنا شروع کیں کہ کھال اُدھڑ گئی اور خون کے فوارے بہنے لگے، اس سزا کو چور بغیر کسی فریاد کے خاموشی سے برداشت کرتا رہا، یہانتک کہ وہ بیہوش ہوگیا اور اس طرح یہ دردناک سین ختم ہوا۔

جھوٹ کا انسداد

انصاف و قانون کی دنیا میں، ہمیشہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جھوٹ بولنے والے کا جھوٹ کسی نہ کسی طرح معلوم ہو جائے، چنانچہ چین میں کسی وقت یہ دستور تھا کہ جن لوگوں پر جرم کا شبہ ہوتا تھا ان کو چاول چبانے کے لئے دئے جاتے تھے اور جس وقت وہ چاول چباتے تھے ان سے سوالات کئے جاتے تھے۔

اس کے بعد ان سے کہا جاتا تھا کہ چاول تھوک دو، اور جس کے چاول خشک نکلتے تھے اس کو جرم سمجھا جاتا تھا۔

ہندوستان میں خیال کیا جاتا تھا کہ اگر تفتیش حال کے وقت کوئی مشتبہ شخص اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو حرکت دے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔

ایک ہندو راجا کا قصہ مشہور ہے کہ وہ جھوٹ پکڑنے کی یہ ترکیب کرتا تھا کہ تمام مشتبہ آدمیوں کو گرفتار کرکے ایک کمرے میں دیوار کی طرف منہ کرکے برابر برابر کھڑا کر دیتا تھا اور ان سے کہا جاتا تھا کہ پاس کے کمرے میں ایک مقدس گدھا ہے اور اگر مجرم اس کی دُم کھینچتا ہے تو وہ فوراً بولنے لگتا ہے اس کے بعد ہر شخص سے کہا جاتا تھا کہ وہ کمرے میں جاکر گدھے کی دُم کھینچے اور پھر اپنے ہاتھ پیٹھ کی طرف کرکے جہاں کھڑا تھا وہیں آکر کھڑا ہو جائے اس ترکیب سے پتہ چل جاتا تھا کہ مُجرم کون ہے، کیونکہ گدھے کی دُم میں کاجل لگا ہوتا تھا اور مجرم چونکہ ڈر کے مارے اسے نہ چھوتا تھا اس لئے اس کا ہاتھ صاف رہتا تھا۔

لڑائی سے پہلے پروفیسر ولیم مارسٹن (ہارورڈ یونیورسٹی) نے تجربات سے ثابت کیا کہ جب کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو ایک خاص قسم کا دباؤ قلب کے شریانوں میں پیدا ہوتا ہے اور سانس میں بھی ہلکی سی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۹۲۵ء میں لیونارڈ کیلر نے ایک آلہ جھوٹ پکڑنے کا ایجاد کیا جس کا نام Keeler polygraph تھا، جو جھوٹ بولتے وقت خون کے دباؤ، سانس کی حالت اور دوسرے نفسیاتی تغیرات کو فوراً بتا دیتا ہے۔ جس شخص سے سوال کیا جاتا ہے اس کی نگاہ سے یہ آلہ غائب ہوتا ہے اور ہر آدھ منٹ کے بعد مشتبہ شخص سے سوال کیا جاتا ہے جس کا جواب اسے ہاں یا نہیں میں دینا پڑتا ہے اور اسی وقت یہ آلہ تمام دموی و نفسیاتی تغیرات کو ریکارڈ کر لیتا ہے۔

یہ آلہ اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ اس کا نام سنتے ہی بہت سے مُجرم اقبال جُرم کر لیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا جھوٹ چھپ نہیں سکتا۔

دنیا کا قدیم ترین معاہدہ وہ ہے جو ۱۳۰۰ برس قبل مسیح رامسیس ثانی (فرعون مصر) اور کیتھار سار، ہٹی (Hittites) قوم کے بادشاہ کے درمیان ہوا تھا۔ یہ معاہدہ ایک نقرئی تختی پر نقش کیا گیا تھا اور اس کے شرائط یہ تھے کہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہ کریں گے اور اگر کوئی اور حکومت ان میں سے کسی پر حملہ کرے گی تو دوسرا اپنے حلیف کی مدد کرے گا۔

موجودہ معاہدوں میں بھی یہی شرط ہوتی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ اس قدیم ترین معاہدہ کی حرف بہ حرف پابندی کی گئی اور اب جدید معاہدے اس سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

البانیا کی ایک عجیب رسم البانیا کی کوہستانی قوموں میں یہ رسم پائی جاتی ہے کہ جب قبائلی جنگ میں کسی خاندان کا آخری مرد قتل ہو جاتا ہے تو اس خاندان کی سب سے بڑی لڑکی، اپنے شوہر کو چھوڑ کر مردانہ لباس پہن لیتی ہے اور خاندان کی سردار شمار کی جاتی ہے۔

ایک عجیب کتاب ولایت میں قاعدہ ہے کہ ہر گھر میں ایک کتاب ہوتی ہے جس میں ملاقاتی اپنے دستخط کر دیتے ہیں اور اس قسم کی سب سے بڑی کتاب غالباً وہ ہے جو کنٹکی کے ایک اصطبل میں پائی جاتی ہے۔ یہ اصطبل ایک مشہور گھوڑے (مین آف وار) کا ہے، جسکے دیکھنے کے لئے اس وقت تک ۲۰ لاکھ آدمی آ چکے ہیں۔

"نگار" کے پرانے پرچے

۱۹۲۶ء جنوری = ۱۲ر — ۱۹۳۰ء مئی عہ ر — ۱۹۳۱ء جولائی، اگست فی پرچہ ۸ر۔ اکتوبر تا دسمبر فی پرچہ ۸ر
۱۹۳۲ء فروری، مارچ فی پرچہ ۱۲ر۔ مئی، جون، جولائی فی پرچہ ۸ر، ستمبر و نومبر فی پرچہ ۸ — ۱۹۳۴ء فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر فی پرچہ عہ ر — ۱۹۳۶ء دسمبر عہ ر — ۱۹۳۷ء فروری تا اگست فی پرچہ ۸ر اکتوبر عہ ر — ۱۹۳۸ء فروری، اپریل = ۱۲ر فی پرچہ۔ مئی تا دسمبر ۸ر فی پرچہ — ۱۹۳۹ء فروری تا جولائی فی پرچہ ۸ر۔ اکتوبر، نومبر فی پرچہ ۱۲ر — ۱۹۴۰ء فروری تا دسمبر (جون، جولائی، اگست نہیں ہے) فی پرچہ ۸ر
۱۹۴۱ء مارچ تا دسمبر (ستمبر نہیں ہے) = للعہ ر — ۱۹۴۲ء مارچ تا مئی فی پرچہ ۸ر۔ اگست، ستمبر، اکتوبر و نومبر ۸ر — ۱۹۴۳ء مئی = ۱۲۔ [illegible] تا دسمبر فی پرچہ ۱۲ر — ۱۹۴۴ء مئی تا دسمبر مسلسل ۱۲ر فی پرچہ۔
۱۹۴۵ء اپریل = ۸ر۔ مئی = عہ ر۔ جون، جولائی = ۱۴ر فی پرچہ۔ اگست تا دسمبر ۸ر فی پرچہ — ۱۹۴۶ء اپریل تا اگست فی پرچہ ۸ر۔ ستمبر تا دسمبر فی پرچہ ۱۲ر۔ (مکمل فائل ۱۹۴۶ء = عہ ۱۰ر)

مینجر نگار لکھنؤ

گردِ منزل

ابر و باد کی زد پہ کتنے آفتاب آئے
کتنے ماہتابوں سے جھانکتے رہے سائے !

بربطوں کے تاروں نے کتنے گیت برسائے
ہر سیاہ بادل نے کتنے جام کھنکائے !

مستی و جوانی نے کتنے قہقہے ڈھالے
توبہ توڑنے آئے ابر کسقدر کالے !

پھول کتنے مسکرائے، دہکے کس قدر لالے
ٹوٹتے رہے کانٹے، پھوٹتے رہے چھالے !

دعوتِ چمن دی ہے کیسے کیسے پھولوں نے
میرا نام پوچھا ہے آہ کن رسولوں نے !

ہر نفس کو نغموں میں تولتے رہے بادل
مستیاں ہواؤں میں گھولتے رہے بادل !

کتنی نم ہواؤں نے بارہا کہا مجھ سے
اُٹھ! کہ اِن گھٹاؤں کو دشمنی نہیں تجھ سے !

رنگ و بو کا ہنگامہ سوگوار ہے تیرا
اب بھی اُن نگاہوں کو انتظار ہے تیرا !!

حسرتیں بھی اک تہمت، آرزو بھی اک الزام
میری گفتگو رسوا، میری خامشی بدنام !!

یاد کردہ دن جس دن نم فشاں تھی چشمِ ناز
ہر نگاہ اک "نالہ"، ہر سکوت اک "آواز" !

نیچی نیچی آنکھوں میں اک غمِ فسانہ ساز
بہکی بہکی نظروں میں ایک شوخیٔ غماز !

بھیگی بھیگی پلکوں پر سُرخ سُرخ سا آنچل
پھوٹتے ہوئے آنسو، پھیلتا ہوا کاجل !

کچھ خیال بھٹکا سا، کچھ نگاہ بیگانہ،
ایک رنگ کا آنا، ایک رنگ کا جانا !!

وہ جھکی جھکی نظریں، وہ رُکی رُکی آواز
ناتمام سا اِک گیت، ٹوٹتا ہوا اک ساز !!

تو نے خود مرا دامن کتنی بار کھینچا ہے،
میں نے ہر جراحت کو قہقہے سے سینچا ہے !

میں ابھی نہیں بھولا تیرے جام، تیرے ساز!
ایک بار پھر دے لوں دور سے تجھے آواز !

کھو گئیں مری صبحیں میری گردِ منزل میں،
ایک رات پھر ہوتی کاش تیری محفل میں !!

پروفیسر شور

غزل : لطفی رضوانی

کبھی خیال کبھی بنکے برق طور آئے
جب ان کو یاد کیا سامنے ضرور آئے

یہ کیا کہ صبح کو نالے ہیں شام کو آہیں
کبھی تو صبر تجھے قلب ناصبور آئے

نگاہِ شوق نہ ہوتی تھی مطمئن نہ ہوئی
اگرچہ رادِ طلب میں ہزار طور آئے

عجیب حال ہے کچھ تم پہ مٹنے والوں کا
کہ جتنا سوز بڑھے اتنا منہ پہ نور آئے

نظر کسی کی ندامت سے کیا جھکی لطفی
کہ یاد مجھ کو خود اپنے ہی سب قصور آئے

غزل : سلیمان اریب

اے سروِ رواں اے جانِ جہاں آہستہ گزر آہستہ گزر
جی بھر کے میں تجھ کو دیکھ تو لوں بس اتنا ٹھہر بس اتنا ٹھہر

کچھ لوگ ابھی تک ایسے ہیں جو تابِ نظارہ رکھتے ہیں!
اے حسنِ دل آرا اور نکھرا اے کاکلِ پُرخم اور سنور

وہ ماہ نہیں خورشید نہیں کہنے کو اک انساں ہے پھر بھی!
تاریک نظر آتا ہے جہاں ہٹتی ہے جب اس کے رُخ سے نظر

پہلے تو یہ اپنا حال نہ تھا بے چین نہ تھے بیتاب نہ تھے۔!
کیا عشق میں یوں ہی ہوتا ہے اک آگ سی ہے دل تا بہ جگر؟

یہ کانٹے کیا یہ چھالے کیا خود پھول کھلیں گے راہوں میں
اے اہلِ طلب ہے شرطِ سفر اُٹھو تو سہی باندھو تو کمر

ادیب سہارنپوری:

عتاب و جور کے مارے بہت ملیں گے مگر — ہمیں تباہ کیا مسکرانے والوں نے
بھلا سکے نہ ہم ان کو اگرچہ سنتے ہیں، — بھلا دیا ہے خدا کو بھلانے والوں نے،
سکوں تو لے ہی گئے تھے وہ چھین کر لیکن — تڑپنے بھی نہ دیا دل بڑھانے والوں نے
قفس میں رہ کے بھی ہم تو انھیں نہ بھول سکے — ہمیں بھی یاد کیا آشیانے والوں نے؟
علاجِ درد سے کچھ اور درد بڑھ ہی گیا — اُنھیں کا ذکر کیا آنے جانے والوں نے

قمر بھساولی:

یہ تصورات کی محفلیں یہ تخیلات کے مشغلے، — کبھی آ گئے تیرے پاس ہم کبھی اور دور نکل گئے
وہ اُمید حاصلِ زیست ہے جو ہلاک وعدۂ دوست ہے — وہی پھول جانِ بہار ہے جو نسیم صبح سے جل گئے
دیکھ کے کس سے سنبھلا جائے — دیکھ رہا ہوں تجھ کو سنبھل کے

کلام حرمت الکرام:

مقام ایسا بھی اک آتا ہے راہ زندگانی میں — جہاں منزل بھی گرد کارواں معلوم ہوتی ہے
کبھی اک آگ ایسی بھی بھڑک اُٹھتی ہے سینے میں — کہ ہر کیفیتِ دل کو جلن کہنا ہی پڑتا ہے،
زمانہ لاکھ ہو برہم مخالف لاکھ ہو دنیا — مگر افسانۂ دار و رسن کہنا ہی پڑتا ہے،

اس ترکِ محبت پر بھی کبھی، حرمت جو وہ یاد آجاتے ہیں
اس وقت عجب کچھ ہوتا ہے جذبات کا عالم کیا کہیئے

جھوٹا اشتہار دینے والوں سے جس قدر بچا جائے اسی میں بہتر ہے، زیادہ کہنا سننا بے سود ہے، ماننا نہ ماننا آپ کا فعل ہے۔
مجروح غنیم بری ولایت سے دو دوا لائے ہیں جو بقول ان کے بواسیر کے لئے اکسیر ہے، جوان، بوڑھے سب کھا رہے ہیں، کمزوری کے لئے اکسیر صفت ہے، جوان، بوڑھے سب کھا رہے ہیں، اس دوا کے مقابلہ میں بیکار دوائیں قیمتی اور دیدہ زیب عبارت بیکار ہیں، اس سے بھوک اس قدر بڑھتی ہے کہ دو تین سیر دودھ اور پی جائیے، کبھی مضر کیفیت نہیں ہوتی، اس قدر مقوی دواغ ہے کہ کمزوری کی باتیں بھی بھول جائیے، بعد بیماری کے بھی اس کو مثل آبِ حیات کے تصور فرمائیے، اس کے استعمال کرنے سے پہلے اپنا وزن کر لیجئے، ایک شیشی ہی میں بیسیوں کے وزن میں اضافہ ہو جائے گا، اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی تکان نہ ہوگی۔ یہ دوا رخسار دل کو مثل گلاب کے پھول کے بنا دے گی۔ یہ دوا ہی نہیں بلکہ بیسیوں کے اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا ہی نہیں بلکہ بیسیوں کے ہزاروں کے جوان بنا دے گی۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے، آپ خود آزما لیجئے، اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی تکان نہ ہوگی۔ یہ دوا ہی نہیں بلکہ بیسیوں کے اور مثل کندن کے درخشاں بنا دے گی۔ یہ دوا ہی نہیں بلکہ بیسیوں کے ہزاروں کے جوان بنا دے گی۔ یہ نہایت درجہ مقوی باہ ہے، آپ خود آزما لیجئے، اس کے استعمال سے ۱۸ گھنٹے کام کرنے کے بعد بھی تکان نہیں ہوتی، اس سے بہتر مقوی دوا دنیا بھر میں نہیں ہے۔
قیمت فی شیشی عہ روپیہ (الصدر) (نوٹ) فایدہ نہ ہو تو قیمت واپس۔ فہرست دوا فی نفسہ مفت منگا لیجئے۔ میں اشتہار کو حاضر وناظر جان کر لکھتا ہوں کہ یہ دوا اکسیر کا کام کرتی ہے۔ نقالوں سے ہوشیار رہئے، میری ۴۰ سالہ شہرت پر بھروسہ فرمائیے۔
پتہ:- حکیم ثابت علی بیخ زبان، خوش کلام
(عالم مثنوی مولانا سے روم صاحب)
محمود فگار سیوھاروی لکھنؤ۔ لیڈ۔ پی

مطبوعات موصولہ

روپ پروفیسر فراق گورکھپوری کی ۳۵۱ رباعیوں کا مجموعہ ہے جو اس سے قبل مختلف رسایل میں شایع ہو چکی ہیں۔ رباعی بہت مشکل صنف سخن ہے، کیونکہ اس کا وزن بھی محدود، اور مصرعے بھی محدود۔ اور اس لئے شعراء اس وقت تک رباعیاں نہ کہتے تھے جب تک کافی مشق نہ ہو جائے۔ اس سے قبل رباعی صرف پند و نصائح یا معارف و حقایق کے لئے مخصوص تھی، یہاں تک کہ جو رباعیاں رندانہ رنگ کی ہوتی تھیں، تاویل کر کے ان کو بھی حقیقت کا رنگ دیدیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ تخصیص باقی نہیں ہے اور ایک شاعر آزاد ہے کہ وہ رباعی میں جو چاہے بیان کرے، چنانچہ موجودہ شعراء میں متداول رنگ سے ہٹکر سب سے پہلے جوش نے رباعیاں لکھنا شروع کیں اور اب ان کے اتباع میں فراق نے بھی اس طرف توجہ کی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ جوش کے یہاں رندی و آزادی پائی جاتی ہے اور فراق کے یہاں رعنائی و برنائی۔ جوش کی رباعیوں کا حسن خیال و بیان کی بیباکی ہے اور فراق کی رباعیاں ہندی کا سنگھار اس اور غالباً اسی لئے انھوں نے کہیں کہیں رباعی کے فارسی وزن سے ہٹ کر ہندی نگل (عروض) کا اتباع کیا ہے جس کا مقصود الفاظ کو کھینچ تان کر موسیقی کی تال میں لے آنا ہے۔

کتابت و طباعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ بُرا نہیں ہے۔ قیمت ۸؍ ہے جو ۲۰۰ صفحات کی کتابت کے لئے یقیناً زاید ہے۔ ملنے کا پتہ: سنگم پبلشنگ ہاؤس۔ بنیک روڈ۔ الہ آباد۔

اسلام اور سود ڈاکٹر انور اقبال قریشی صدر شعبۂ معاشیات جامعۂ عثمانیہ کی تصنیف ہے۔ یہ دوسرا اڈیشن ہے اور نظر ثانی کے بعد اس کو زیادہ قریب الفہم بنایا گیا ہے۔ جس حد تک اصطلاحات کے ترجمہ کا تعلق ہے، اس کے مشکلات البتہ بدستور قایم ہیں، ضرورت تھی کہ ہر اصطلاح کی تشریح بھی سہل الفاظ میں کر دیجاتی اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی اصطلاح بھی درج کر دیجاتی تاکہ انگریزی داں طبقہ اور عوام بھی اس کو سمجھ سکتے پہلے اڈیشن پر ہم اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں۔ کتاب بہر نوع بہت مفید ہے اور سود کے متعلق اسلام کا نظریہ سمجھنے میں اس کا مطالعہ استفادہ سے خالی نہیں۔

ضخامت ۲۸۶ صفحات، کاغذ چکنا، طباعت و کتابت پسندیدہ، قیمت ۸؍ ہے، ملنے کا پتہ:— نفیس اکاڈیمی، حامد روڈ حیدر آباد دکن۔

سہیل کی سرگزشت عرصہ ہوا پروفیسر رشید احمد صدیقی کی ادارت میں ایک سہ ماہی رسالہ سہیل کے نام سے جاری ہوا تھا جو زیادہ نہ چل سکا۔ لیکن اس تھوڑی سی مدت میں رشید صاحب نے جو کچھ سہیل میں لکھا، وہ بھی کم دلچسپ نہ تھا، چنانچہ اب اسی رسالہ کے مختلف مضامین اس نام سے شایع کئے گئے ہیں جن میں زیادہ تر وقتی و مقامی مدیرانہ نوٹ ہیں۔ ایک طویل مضمون پیام اقبال کے عنوان سے بھی ہے جو بڑے کام کی چیز ہے۔ ضخامت ۳۲۰ صفحات طباعت و کتابت وغیرہ بہت صاف، قیمت ۱۲ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ نفیس اکاڈیمی حیدر آباد دکن۔

عشق جہانگیر خواجہ محمد شفیع صاحب، دہلوی کی تصنیف ہے جس میں جہانگیر کے ایک فرضی افسانہ محبت کو رنگین عبارت میں پیش کیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب کو دلی کی زبان پر خاص عبور حاصل ہے اور اگر ہم اسکی تکلف و تصنع کو نظر انداز کر دیں جو محض زباندانی کے اظہار کے لئے برتا گیا ہے، تو کتاب طرز تحریر کے لحاظ سے کافی دلچسپ ہے۔

خواجہ صاحب کا بیان ہے کہ اس ناول میں انھوں نے فرانس کے مشہور ناول نگار ڈوما کا تتبع کیا ہے، لیکن ہماری رائے میں یہ تتبع ناقص و ناکامیاب ہے، اور اس کوشش نے قصہ میں زیادہ اُلجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔

فسانہ چونکہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اس لئے تاریخی حیثیت سے اس کا مطالعہ بیکار ہے، لیکن اس لحاظ سے کہ عہد مغلیہ کے معیشت و معاشرت پر اس سے کچھ روشنی پڑتی ہے — دلچسپی سے خالی نہیں ضخامت ۱۴۸ صفحات، طباعت و کتابت پسندیدہ۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ ادب، لال کنواں، دہلی۔

شرح میر درد یہ تصنیف بھی خواجہ محمد شفیع صاحب کی ہے۔ جس میں میر درد کے کلام کی شرح کی گئی ہے، خواجہ صاحب نے اس شرح سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خواجہ میر درد کا کوئی شعر تصوف سے خالی نہ ہوتا تھا اور اس کوشش میں انھوں نے درد کے بہت سے اشعار کو بے لطف بنا دیا ہے اول تو اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ درد کے کلام کی شرح کیجاتی اور اگر بربنائے عقیدت خواجہ صاحب نے اس کو ضروری سمجھا تھا تو صرف ان اشعار کی درویشانہ شرح کر دیتے جو واقعی تصوف کے رنگ کے ہیں اور باقی کو صرف اہل ذوق کے لئے چھوڑ دیتے۔ کتاب کا نام بھی بے معنی ہے۔ "شرح درد" زیادہ موزوں نام ہوتا۔ ضخامت ۲۰۸ صفحات۔ قیمت ۸؎ ملنے کا پتہ: مکتبۂ ادب لال کنواں۔ دہلی۔

بیگمات اودھ کے خطوط مجموعہ ہے واجد علی شاہ کی بعض بیگموں کے خطوط کا جو انھوں نے جانعالم کے نام مٹیا برج بھیجے تھے۔ ان خطوط سے اس وقت کے تاریخی حالات پر تو کوئی

روشنی نہیں پڑتی، لیکن اس وقت کا طرزِ تحریر ضرور سامنے آجاتا ہے جو اپنی جگہ کافی دلچسپ ہے۔
یہ مجموعہ انتظام اللہ صاحب شہابی نے مختلف ذرائع سے فراہم کرکے مرتب کیا ہے۔ اگر ان خطوط کے ساتھ مختصراً بیگموں کے حالات بھی درج ہوتے تو یہ مجموعہ زیادہ مفید و دلکش ہو جاتا۔ ضخامت ۱۴۸ صفحات۔ قیمت دو روپیہ۔
ملنے کا پتہ: مکتبۂ ادب اُردو بازار۔ دہلی۔

ڈھونگ ناول ہے جناب شوکت تھانوی کا جس میں انھوں نے ایک افسانۂ محبت اپنے مخصوص انداز میں قلمبند کیا ہے۔ جناب شوکت نے زیادہ تر مختصر افسانے لکھے ہیں اور مزاحیہ رنگ انھیں میں زیادہ کھلتا ہے، لیکن ناول اور وہ بھی "رومانِ محبت" اس سے ہٹ کر بالکل مختلف انداز بیان چاہتا ہے، جو شوکت صاحب کا رنگ نہیں۔ بہرحال ناول دلچسپ ہے۔ ضخامت ۲۲۲ صفحات۔ قیمت دو روپیہ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔
ہندوستانی پبلشرز دہلی۔

زیدی کا حشر مجنوں گورکھپوری کا سب سے پہلا افسانہ ہے جو سب سے پہلے نگار میں شایع ہوا تھا (۱۹۲۵ء) اور جو ان کی شہرت افسانہ نگاری کا سنگ بنیاد ہے، یہ فساد مجنوں کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ہے، جب ان کا دل تازہ چوٹ کھایا ہوا تھا اور ان کی محبت ناکام کا زخم ابھی ناسور نہ بنا تھا۔ اس لئے اس میں ہم کو بہت سی وہ باتیں اپنے رومانی رنگ میں نظر آتی ہیں، جو بعد کو اُن کے افسانوں میں فلسفہ و نفسیات بنکر رہ گئیں۔
ضخامت ۱۴۰ صفحات قیمت ۱۲ر۔ ملنے کا پتہ: سی پی اُردو اکاڈیمی ناگپور۔

مریم مجدلانی ترجمہ ہے جناب مجنوں گورکھپوری کے قلم سے مارس مترلنک کی ایک مشہور تمثیل کا جو سب سے پہلے رسالۂ ایوان گورکھپور میں شایع ہوا تھا (۱۹۳۴ء)
مترلنک، بلجیم کا مشہور تمثیل نگار تھا جس کا اس کی بعض خصوصیات ادب پر نوبل پرائز بھی ملا۔ مترلنک پہلا شخص ہے جس نے تمثیل نگاری میں "وجدانیات" کو شامل کیا اور حرکات سے زیادہ بلیغ و موثر ثابت کر دکھایا۔ مریم مجدلانی اسی خصوصیت کے لحاظ سے مترلنک کا شاہکار ہے، جس کا ترجمہ کرنا بہت مشکل تھا۔
واقعہ عہد مسیح سے تعلق رکھتا ہے، جب لوگ جوق در جوق اُن کے معجزے دیکھ دیکھ کر ان پر ایمان لا رہے تھے۔ مریم مجدلانی ایک بازاری قسم کی عورت تھی جو مسیح کے مواعظ سے متاثر ہو کر اپنے معاصی سے تائب ہوئی اور بلندی اخلاق کے اس حد تک پہونچ گئی کہ اس نے مسیح کی قربانی تو گوارا کر لی، لیکن اپنے اخلاق کی قربانی گوارا نہ کی۔
اس کتاب کا ترجمہ آسان نہ تھا، لیکن جناب مجنوں اس میں بہت کامیاب ہوئے ہیں اور مترلنک کے انداز بیان کی ان تمام خصوصیات کو ترجمہ میں قایم رکھا ہے جنھوں نے اس تمثیل کو مترلنک کا شاہکار بنایا۔ ضخامت ۱۷۸ صفحات قیمت ۱۸ر۔ ملنے کا پتہ: ایوان اشاعت گورکھپور۔

تصریحات مجموعہ ہے جناب محمد مظہر الدین صدیقی بی۔ اے کے بعض مذہبی و ادبی مقالات کا۔ جو مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کو جسے مکتبۂ نشاۃ ثانیہ چنچل گوڑہ حیدرآباد نے شایع کیا ہے، مقالات سے پتہ چلتا ہے کہ صدیقی صاحب بہت سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ اور ان کا مطالعہ افادہ و استفادہ سے خالی نہیں — ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت ۸؎

خونی ہے ہندوستان مجموعہ ہے بھوپال کے ترقی پسند ادیبوں کے اُن افسانوں اور نظموں کا جو فرقہ وارانہ فسادات کے سلسلہ میں لکھے گئے۔ اس کتاب کا مقصد ہندو مسلمانوں کا باہم اتحادِ عمل ہے اور سیاسی نقطۂ نظر سے ان کو ایک مرکز پر لے آنا۔ چونکہ بلند مقصد کو سامنے رکھ کر افسانے اور نظمیں لکھی گئی ہیں، اس لئے اصولاً انھیں بھی بلند ہونا چاہئے۔ ضرورت ہے کہ موجودہ ہنگامہ و فساد کے زمانہ میں اس قسم کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے اور عوام کو بھی ان کے مطالب سے آگاہ کیا جائے۔ اس مجموعہ کو جناب یکتا امروہوی نے مرتب کر کے ملک کی محل خدمت انجام دی ہے۔ قیمت دو روپیہ۔ ملنے کا پتہ: گہوارۂ ادب فیاض گنج بہادر گڑھ روڈ۔ دہلی۔

خرشب جناب کیفی اعظمی کی قومی، سیاسی و ادبی نظموں کا مجموعہ ہے۔ کیفی صاحب کا شمار ترقی پسند شاعروں کی صف اول میں ہے اور اس میں شک نہیں کہ ان کی ذہانت و طباعی ان کے اکثر اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان کی شاعری کا تکنک جدید بھی ہے اور لذیذ بھی۔ ضخامت ۱۴۴ صفحات۔ طباعت و کتابت بغایت پسندیدہ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ: کتب پبلشرز لمیٹڈ بمبئی۔

اسلامی معاشیات تصنیف ہے مولوی سید مناظر احسن صاحب گیلانی کی، جس میں انھوں نے قرآن و حدیث کی مدد سے اسلام کے معاشی مسایل کو پیش کیا ہے۔ اسمیں شک نہیں انھوں نے بڑی محنت و کاوش سے یہ کتاب مرتب کی ہے، جا بجا کتاب بیجا اور غیر ضروری انشا پردازی سے اگر کام نہ لیا جاتا تو بہتر تھا۔ کیا اچھا ہوتا اگر اسکی جگہ وہ یا کوئی صاحب اور اسلامی سیاسیات پر روشنی ڈالتے، جو اس سے زیادہ ضروری ہے۔ کتاب بڑے سایز کے ۴۵۴ صفحات کو محیط ہے اور نہایت نفیس کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے قیمت ۱۲؎ ہے اور ملنے کا پتہ:۔ ادارۂ اشاعت اُردو عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

فلسفۂ کلام غالب پروفیسر شوکت سبزواری کی تصنیف ہے اور موضوع نام سے ظاہر ہے۔ غالب پر اسوقت تک بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن اس کتاب میں غالب کے فلسفۂ کلام پر بالکل نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس لحاظ سے کہا جاتا ہے کہ یہ تصنیف اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل پہلی چیز ہے۔ پروفیسر سبزواری علوم مشرقیہ و مغربیہ دونوں کے فاضل ہیں، اسلئے ان کی تمام تحریروں میں بڑی جامعیت پائی جاتی ہے۔ کتابت و طباعت بہت پسندیدہ ہے۔ قیمت مجلد ۴؎ ہے۔ ملنے کا پتہ: قومی کتب خانہ بریلی۔

کشش مجموعہ ہے محترمہ شفیق بانو کے سولہ افسانوں کا۔ شفیق بانو افسانہ نگار کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتی ہیں اور ان کو یہ شہرت بے وجہ حاصل نہیں ہوئی۔ ان کے افسانوں میں علامہ سلاست بیان، تجزیۂ کردار اور پلاٹ کی خوبی کے جذباتی روح بھی پنہاں ہوتی ہے وہ جو کچھ لکھتی ہیں دُکھے دل سے لکھتی ہیں اس لئے دوسروں کا بھی دل دُکھا دیتی ہیں، طباعت و کتابت پاکیزہ۔ حجم ۲۵۰ صفحات۔ قیمت ۱۲؎ ملنے کا پتہ: قومی کتب خانہ۔ بریلی

"زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے"

مرزا غالب نے یہ مصرع بادشاہ کے ہاتھ میں

چکنی ڈلی دیکھ کر کہا تھا مگر دنیا آجکل اسے

نکٹائی عرک

مال استعمال کر کے پڑھتی ہے

ہر قسم کا زردہ، مشکی قوام، دانہ الائچی۔ تیل، عطر، عرق کیوڑہ و گلاب اور مختلف قسم کے پان مسالوں کو مشرقی نفاست اور طبّی احتیاط کے ساتھ تیار کرنے والا مشرقی ہندوستان کا قدیم ترین کارخانہ آپ کی فرمائشات کا منتظر ہے۔

فہرست طلب فرمائیے

ٹیلی گرام
"مشکی قوام ہوڑہ

ٹیلی فون
"ہوڑہ ۴۵۵"

نکٹائی برانڈرزدہ فیکٹری۔ ۱۴۱ ہوڑہ روڈ۔ ہوڑہ

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہوجاتا ہے اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

۱— چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

۲— مادیئین کا مذہب

نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

فراست الید

مولفۂ نیاز فتحپوری جسکے مطالعہ سے ایک شخص بآسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس کو شروع کردینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اُٹھ جانیکے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے بادیان طریقت و علماء کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور انکا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات (دو حصے)

حضرت نیاز فتحپوری کے انتقادی مقالات جو دو حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں، پہلے حصہ میں وہ مقالات ہیں جن میں خاص خاص شعراء کے کلام پر تنقید کی گئی ہے، مثلاً:- مومن، ظفر، غالب، مصحفی، نظیر، سیماب، جوش، اصغر وغیرہ وغیرہ، دوسرے حصہ میں عام ادبی و انتقادی مباحث ہیں جن کا تعلق شعر و ادب کی تاریخ سے ہے۔

قیمت حصۂ اول للعہ۔ حصۂ دوم للعہ

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقال جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور یہ دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔

اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنے رکھتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

زیر طبع

مطالعات نیاز

حضرت نیاز کے علمی و تاریخی مقالات کا مجموعہ

من و یزداں

حضرت نیاز فتحپوری کے اُن مذہبی مقالات کا مجموعہ جنھوں نے دنیائے مذہب میں ہلچل ڈالدی تھی

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری سنہ ۳۹ء
(مصحفی نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
حیات مصحفی۔ اُردو غزلگوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔
مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۰ء
(نظیر نمبر)
اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
نظیر کا مسلک
شاعری پر تبصرہ
نظیر اور عوام
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۱ء
یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے۔ یعنی اس وقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔
قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۲ء
اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۴۱ء میں شایع ہوا تھا۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۳ء
اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۴۵ء (قرآن نمبر) اس میں ڈاکٹر لٹسڈل کے اُن اعتراضات کو پیش کیا گیا ہے جو ماخذ القرآن کے عنوان سے کئے گئے ہیں۔ حضرت نیاز کے فٹ نوٹ اور استدراک کے ساتھ ——— قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری، مارچ سنہ ۴۶ء یہ سالنامہ دو حصوں میں شایع ہوا ہے اور فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ جنوری کا ہے اور دوسرے حصہ میں فروری، مارچ دونوں نمبر شامل ہیں۔ قیمت ہر حصہ کی ۸ر

جنوری سنہ ۴۷ء اس سالنامہ کا نام "ماجدولین نمبر" ہے جس میں ایک بے مثل فرانسیسی ادیب کی ایک شاہکار ٹریجڈی کو اُردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ ادبیت و جذبات نگاری کے لحاظ سے یہ ناول اپنا نظیر نہیں رکھتا ——— قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ علاوہ محصول

نرخنامہ اُجرت اشتہار

ایک سال	چھ ماہ	تین ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ ۶۰۰ روپیہ	۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۵۰ روپیہ
آدھا صفحہ ۳۰۰ روپیہ	۱۵۰ روپیہ	۷۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
چوتھائی صفحہ ۱۵۰	۷۵ روپیہ	۴۰ روپیہ	۱۴ روپیہ

"نگار" کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ۔ ششماہی جاری نہیں ہو سکتا۔ سالانہ بیرون ہند دس روپیہ۔
(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ تک شایع ہوتا ہے اور ۱۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے ورنہ پھر کسی طرح نہیں مل سکتا۔ "منیجر"

——— کمیشن وغیرہ کی مزید تفصیلات ———
——— اور قواعد طلب کیجئے۔ منیجر ———

جواب کے لئے ٹکٹ بھیجنا ضروری ہے اور خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے۔

مطبوعہ مختار پریس لکھنؤ (پرنٹر و پبلشر: ایس حسین)